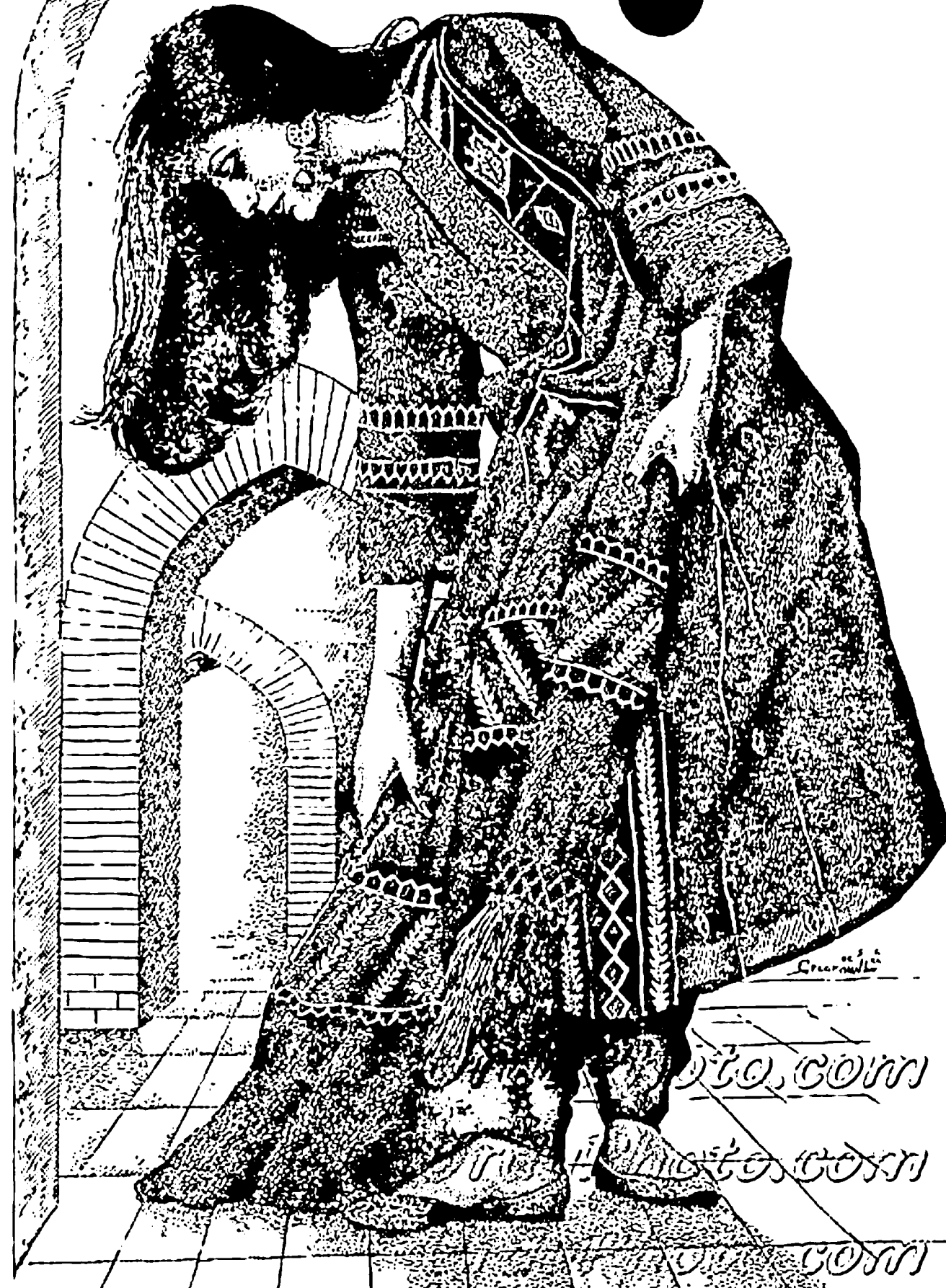


# دردِ دل کا راز



اسپورٹس چینل سے خواہشیں کی رینگ لگ گئی۔ اس کی کشتی با آوازوں میں دیوے کی طرح تھل تھل کر چلی۔ اس کی دیکھ کر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ نے دروازے سے اندر جھانک کر بغور اس کی مگر ملاحظہ کی اور وہیں کھڑے کھڑے اپنی ہڈی کا اظہار کیا۔

”یہ لڑکی بھرتی عورتوں کو اپنے گھر سے دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنی ہی صنف کی بے وقعتی۔ چہ چہ۔“

اس کی کوپا تھا اب آپ کی توپوں کا رخ یقیناً اس کی اعلیٰ کی طرف ہو گا۔ اس نے فوراً ”چینل بدل دیا۔“

اس ایک ماڈل گرل اپنے زیریں خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

”پاکستان میں ماڈلنگ کے شعبے میں اب بہت ترقی ہو رہی ہے۔ ہماری ماڈل گرلز کسی طرح بھی دو سرے ممالک کی ماڈلز سے پیچھے نہیں ہیں۔“

”اس کا لباس دیکھ کر ہی ”ترقی“ کا اظہار ہو رہا ہے۔“

”اے“ رابعہ اندر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی جھنجھلا کر لڑکی ہنسنے لگی۔

”پتا ہے آج شام کو بڑے ابا گاؤں سے آرہے ہیں۔“

”سچ؟“ اس کے لبے میں بے یقینی تھی۔

”نہیں کیوں جھوٹ بولوں گی؟“ ابو کہہ رہے تھے کہ رات کے کھانے پہ اہتمام کر لینا۔ اب اٹھو فوراً میرے ساتھ کچن میں آؤ اور پیلمپ کراؤ۔ تین چار ڈشز اضافی ہوں گی۔ تم مجھے پیاز کاٹ دینا سویت ڈش کی ڈرنگ کر دینا سبزیاں اور گوشت دھو دینا۔ تمہارا یہی

## مکمل ناول



احسان عظیم ہو گا مجھ ناچیز پر۔“  
”مستقبل کی عظیم اور نامور ڈاکٹر کی یہ بے عزتی“  
اس سے کچن میں کام کروایا جا رہا ہے۔“ وہ مصنوعی  
تاسف سے منہ بسورنے لگی۔  
رابعہ چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے اس سے  
باتیں بھی کرتی رہی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کی مطلوبہ  
ڈشز تیار ہو گئیں۔  
”گڈ! اب پلاؤ رات اور سلا درمیان ہے۔ وہ رات کو  
بنالیں گے۔ کباب بھی رات میں تلیں گے۔“ رابعہ  
نے اطمینان کا سانس لیا۔

”پتا ہے مجھے بڑے ابا بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرا  
دل کرتا ہے کاش دادا امی بھی زندہ ہوتیں۔ میں گاؤں  
جاتی ان کے پاس رہتی رات کو ان کے پاس سوتی اور  
رانے وقتوں کے قصے سنتی۔ جب آسمان ہر طرح کی  
آلودگی سے پاک صاف شفاف اور نیلا ہوتا تھا اور جب  
نیکی کی پریاں چھم سے ہر گھر میں اتر کر تیں۔ وہ  
آنکھیں موندے بولتی جا رہی تھیں۔“  
”اسری! کبھی کبھی تو تم مجھے ڈاکٹر کے بجائے شاعرہ  
لگتی ہو۔ یوں لگتا ہے تم صدیوں پہلے کے ماحول اور دنیا  
میں رہتی ہو۔ تمہاری روح ماضی کے کھنڈروں میں  
بھٹکتی رہتی ہے۔ میری جان! نیکی کی پریاں تو صرف  
قصے کہانیوں میں ہوتی ہیں۔“

”تو کیا ہوا“ میں ان سے ماضی کی کہانیاں اور قصے ہی  
سن لیتی۔ ”اس کا لہجہ ابھی تک خوابناک سا تھا۔  
”اسری! تم حد سے زیادہ تصوراتی ہو حساس ہو۔  
تمہارے خیالات اتنے نرم و نازک ہیں کہ چھوٹے ہی  
لگتا ہے حقیقت کی گرم بے رحم فضا میں جھلس  
جائیں گے۔“

”زندگی جاذب دشتِ سحر کی طرح ہے۔“  
”زندگی جاذب دشتِ سحر کی طرح ہے۔“  
”زندگی جاذب دشتِ سحر کی طرح ہے۔“  
”زندگی جاذب دشتِ سحر کی طرح ہے۔“

تمام باتوں کے پس پردہ کیا کچھ ہے۔“  
رابعہ کا لہجہ از خود بھاری سا ہو گیا تو اسری فوراً  
سابقہ کیفیت کے حصار سے نکلی۔  
”چھوڑیں بھی میں نے تو یونہی ایک عام سی بات  
کی تھی۔ آپ نہ جانے کہاں پہنچ گئیں۔ میں تو سوچ  
رہی ہوں کہ بڑے ابا کے آنے پر کتنا مزا آئے گا۔  
میں جو نئی اینگزام سے فارغ ہوئی تو گاؤں جاؤں گی اور  
مزے سے گھوموں پھروں گی۔“ رابعہ مسکرا دی۔  
اسری کی پل پل بدلنے والی فطرت کبھی کبھی اسے بے  
انتہا مضطرب کر دیتی تھی۔

بڑے ابا سے وہ اتنے ڈالمانہ انداز میں ملی کہ  
ایک ٹائیپ کے لیے وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ بڑے ابا  
حسب معمول اپنے پروتار اور لیے دیے سے انداز  
میں ملے۔ رابعہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا وہ ابھی  
تک ان کے دائیں بازو کے گھیرے میں تھی۔ رابعہ  
سلام دعا اور سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد  
کچن میں چلی آئی جبکہ اسری ابھی تک بڑے ابا کے  
پاس بیٹھی باتیں بگھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ بڑے ابا اور ہاشم  
گیلانی دونوں آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔  
اسری دوبار جھانک چکی تھی۔ رابعہ کچن کا پھیلاوا سمیٹنے  
میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے آواز دے کر اسری کو اپنے  
پاس بلا یا تو وہ بد مزاسی ہو گئی۔

”بتائیں کیا کام ہے؟“ ناگواری اس کے لہجے سے  
عمیاں تھی۔ پہلے ہی بڑے ابا اور ابو کی وجہ سے جو آہستہ  
آواز میں باتیں کر رہے تھے چند الفاظ اس کے کان میں  
بھی پڑے تھے۔ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی کیونکہ  
بڑے ابا کا لہجہ بہت تلخ سا تھا۔ اسے باہر سے گزرتے  
دیکھ کر دروازہ بند کر لیا گیا تو وہ الجھ سی گئی۔ اسی اثناء میں  
رابعہ کی آواز اس کے کان میں آئی تو کوشش کے باوجود  
وہ اپنا غصہ چھپانہ سکی۔

”کیا بات ہے صورت شریف پہ بارہ کیوں بچے  
ہیں؟“

”آپ نے کیوں بلوایا ہے؟“ وہ اس کا سوال  
انداز کرتے ہوئے بولی۔

رابعہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور رسان سے  
”میں نے سارا کام ختم کر لیا ہے۔ آؤ اب دونوں  
راستے ہیں۔“ اس نے اتنے ہلکے بھلکے لہجے میں  
الہ اسری شرمندہ سی ہو گئی۔ ڈرائنگ روم سے  
انداز میں قدرے بلند ہوئیں تو رابعہ گھبرا گئی اور  
”اسری! آج چاند کی بارہ تاریخ ہے مگر اس کی  
لی کا ہاتھ پکڑ کر تیز چلتی گیٹ سے باہر آ گئی۔  
”اسری! آج چاند کی بارہ تاریخ ہے مگر اس کی  
لی اور ٹھنڈک تو دیکھو۔ تمہیں چاند بہت پسند ہے

”ہاں آئی! مجھے تنہا چاند بہت اچھا لگتا ہے۔“  
”کے لہجے سے دلی دلی حسرت جھلک رہی تھی۔  
”م آں اسری! یوں مت کہا کرو اتنی قنوطی ہوتی  
ن ہو۔ ایک مزے کی بات بتاؤں۔“ وہ قصداً  
پس پھیلا رہی تھی۔

”ہاں میں سن رہی ہوں۔“  
”کل خاور کا فون آیا تھا۔ ان کی پیر کو سالگرہ ہے  
”اے سچ! مگر مجھے کس خوشی میں کباب میں ہڈی  
ہیں۔“ رابعہ کا چہرہ گلگلوں ہو گیا۔ اسری نے  
م موڈ بدلاتھا۔ اس نے شکر کا سانس لیا۔

”اے گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں تو بڑے ابا اپنی  
جیب میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے نظر آئے۔  
”کے پاس مت فکر سے کھڑے تھے۔ ان کے دیکھتے  
”میتے گاڑی دھول اڑاتی نگاہوں سے او جھل  
”ا۔ شہباز گیلانی تے جاتے ہوئے اسری اور رابعہ کو  
”ماہ کتنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔  
”وہ ان دونوں کو دیکھ چکے تھے۔

”جان! کیا بات ہے۔ یہ بڑے ابا اس وقت کیوں  
”آپ نے روکا کیوں نہیں؟ پورے دو ڈھائی  
”راستہ ہے اتنی دیر سے پہنچیں گے۔“



اس مقامی ہاسپٹل میں آج اسری کی ٹائٹ ڈیوٹی  
تھی۔ اس نے ہاسپٹل پہنچتے ہی گھر فون کیا۔ رابعہ لی  
وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ ہسن کا فون  
سننے کے بعد وہ مطمئن سی ہو گئی۔ ابو اسٹڈی روم میں  
تھیں باقی کا ڈرامہ اس نے پوری دلچسپی سے دیکھا۔  
وہ لی وی بند کر کے اٹھنے لگی تھی جب بڑے ابا  
کا فون آیا۔

ہاشم دھواں دھواں چہرے کے ساتھ ان کے منہ  
سے نکلنے والے الفاظ سن رہے تھے۔

”ہاشم! میں آخری بار کہہ رہا ہوں اس کے بعد میں  
سمجھوں گا تم میرے لیے مر چکے ہو۔“ وہ اتنی سفاکی  
سے کہہ رہے تھے کہ ہاشم کو اپنا سانس سینے میں رکھتا  
محسوس ہوا۔ دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ وہ  
دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہیں ڈھسے سے گئے۔ دل  
کی بیماری انہیں تین چار برسوں سے لاحق تھی مگر اس  
وقت رابعہ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی  
تھی۔ وہ سینے کو بری طرح مسل رہے تھے اور کھانسی  
رہے تھے انہوں نے اشارے سے رابعہ کو اپنی دوائی  
لانے کو کہا۔ وہ واپس آئی تو ان کا سر ایک طرف ڈھلکا  
ہوا اور آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔

رابعہ نے جلدی سے ابو کے قریبی دوست جواد لطیف  
کو فون کر کے ان کی حالت سے آگاہ کیا۔ وہ پندرہ منٹ  
کے اندر اندر ڈاکٹر کے ساتھ آئے۔ ڈاکٹر نے فوراً  
ہاسپٹل لے جانے کا مشورہ دیا۔

رابعہ نے اسری کو اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ ذرا سی بات پر بہت زیادہ پریشان ہو جاتی تھی اور پھر امی کے بعد وہ ابو کے لیے بہت حساس ہو گئی تھی۔ گھر سے قریبی ہاسپٹل میں ہاشم گیلانی کو جواد لطیف نے وقت ضائع کیے بغیر ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ رابعہ صبح تک وہیں رہی۔ گھر ملازم اور جو کیدار کے حوالے تھا جو بڑے ابا نے گاؤں سے بھیجے تھے۔ بے حد قابل اعتماد اور وفادار۔ درحقیقت ملازم رحیم اور جو کیدار فیض بخش شہباز گیلانی کے ایک طرح سے جاسوس ہی تھے۔ تین برس پہلے انہوں نے ضد کر کے خدمت کے بہانے ہاشم کے پاس رکھوائے تھے۔ انہوں نے احترام کی وجہ سے چپ سادھ لی، ورنہ کہہ سکتے تھے شہر میں ملازمین کی کمی تو نہیں ہے۔ گھر کے اکثر کام رابعہ نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ ہاشم فارن سروس میں تھے۔ ملکوں ملکوں گھومنے کی وجہ سے ان سب کو اپنا کام خود کرنے کی عادت تھی۔ رابعہ نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈپلوما لے رکھا تھا۔ چھ ماہ پہلے ہاشم نے جواد لطیف کے بیٹے خاور سے اس کی منگنی کر دی تھی۔ اس رشتے نے ان کے خاندان میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ شہباز گیلانی کئی بار اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ صبح ہی صبح ہاشم گیلانی کے گھر کے آگے تین گاڑیاں آکر رکیں۔ یہ سب گاؤں سے آئے تھے۔ رابعہ کو خاور نے بڑی مشکل سے گھر بھیجا تھا اور خود ہاسپٹل میں تھا۔ بڑے ابا کے ساتھ دونوں چچا ان کی بیٹیاں اور تین بیٹے بھی تھے۔ بڑے ابا کی بیٹی زرین بھی آئی تھی۔ رابعہ نے ان کی خاطر مدارات کرنے کی کوشش کی مگر بڑے ابا نے اسے روک دیا۔

”یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے، ہم سب ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ عورتیں یہیں رہیں گی۔ اگر ہاشم کی طبیعت میں بہتری کے آثار دکھائی نہ دیں تو پھر یہ فیصلہ آئیں گی اور تم فکر بہت کرنا۔“ دل خراش الفاظ سے انہوں نے تو جیسے اس کا سینہ چیر کر رکھا۔ اگر ہم اسے کہہ دیا طبیعت میں بہتری کے آثار دکھائی نہ دیں تو پھر یہ فیصلہ آئیں گی اور تم فکر بہت کرنا۔“

”اللہ نہ کرے جو آج کو کچھ ہو۔“ اس کا رواں روال دعا گو تھا۔ کبھی کبھی بڑے ابا سے سنگ دلی کی انتہاؤں اچھوتے نظر آتے تھے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہا بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔

اس نے اسری کو بتایا تھا۔ وہ فوراً ہی گھر آگئی تھی زرین اسری کو بڑے غور سے تولتی دیکھ جاتی تھی۔ اس سے دیکھ رہی تھی۔ ”یہ تو چادر سر پہ لپیٹی ہے۔“ اس نے سلطانہ خاتون سے سرگوشی کی۔ وہ بھی بغور اس جائزہ لے رہی تھیں۔ اسری کپڑے بدلنے چلی گئی رابعہ خاور سے مسلسل رابطے میں تھی۔

”آئی! میں ہاسپٹل جا رہی ہوں۔“ اس نے منظر سی بیٹھی رابعہ کو بتایا اور ان سب کی طرف آئی۔ ”تم لوگ آئی کی میزبانی سے فیض یاب ہوں، کسی قسم کا تکلف کی ضرورت نہیں ہے، آپ کا اپنا گھر ہے۔“ جس طرح آئی تھی اسی طرح عجلت میں چلی گئی۔

دو دن بعد ہاشم گیلانی کو ہاسپٹل سے فارغ کر دیا گیا۔ اس دوران بڑے ابو دونوں چچا اور ان کے بھائی وہیں رہے تھے۔ زرین اور دو سری خواتین گاؤں والی چلی گئی تھیں۔

اسری ہاشم صاحب کے لیے سوپ لے کر آ رہی تھی کہ بڑے ابا کی تیز آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

”ہاشم! مجھے جلد از جلد جواب چاہیے۔“ اس نے اندر داخل ہوئی تو شہباز گیلانی کے چہرے کی سلونڈ فوراً دور ہو گئیں۔ وہ اسے دیکھ کر شفقت سے مسکرائے۔ اسری ابو کے سرہانے بیٹھ گئی، ان کی آنکھیں بند اور سر بندھال سے انداز میں تکیے پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ابو کے ماتھے پہ اپنا ہاتھ رکھا تو انہوں نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں۔

”ابو! سوپ پی لیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ بیڈ کے سرے سرے پہ شہباز بھی ہاشم کے پاس بیٹھ گئے اور اسری کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔

”تم ہٹو، میں خود پلاتا ہوں۔“ اس نے بڑے ابا کی اس دیکھا۔ کتنی جلدی وہ تیور بدل لیتے تھے۔ ہاشم نے آدھا پیالہ پینے کے بعد ہاتھ سے پیالہ ہٹا دیا۔

شہباز نشو و نما سے ان کے ہونٹ اور منہ صاف تے ہوئے بولے۔ ”جلدی نے ٹھیک ہو جاؤ، ہم کو تمہاری تندرستی کی ضرورت ہے۔ کیوں اسری! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ یہ ٹھیک ہو جائے تو میں اپنی شادی کی تاریخ رکھوں اور تم تو ایک مہینہ پہلے اچھی طرح گھوم پھر کر گاؤں بھی دیکھ لیتا۔“ ام لوگوں کا رہن سہن بھی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ تم ہاؤس جاب مکمل کر لو تو ادھر گاؤں کے ہاسپٹل ہی آ جاؤ۔ وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔“

نی اشات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ شہباز گیلانی کچھ دیر بعد چلے گئے۔ رابعہ اور اسری دونوں ہاشم صاحب کے پاس بیٹھ گئیں۔

”اب آپ مکمل ریسٹ کریں گے، اگر کہیں ای ہوئی تو میں آپ سے بولنا چھوڑ دوں گی۔“ انے دھمکی دی۔ وہ مسکرا دیے اور اس کا سراپنے اگالیا۔

وہ رفتہ رفتہ پہلے کی طرح تندرست نظر آنے کی کوششیں کر رہے تھے، انہیں احساس تھا کہ ان اور رابعہ ان کی وجہ سے کتنی پریشان رہتی ہیں۔ ”ایوٹی روم میں سیاہی ڈاکٹر شہلا اور صدف کے نہ چائے پی رہی تھی تب ہی وہاں ڈاکٹر حمزہ بھی آئے۔“

”مجھے پتا تھا یہاں چائے ہی پی جا رہی ہے چوری۔“ انہوں نے بڑے آرام سے چوتھا کپ اٹھا لیا۔ المصیبت کے لیے تھا۔ چائے ختم کر کے اسری اٹھ لی، وہی تو ڈاکٹر حمزہ سمیت ان دونوں نے بھی اسے اگاہوں سے دیکھا۔

”میں ذرا وی آئی پی وارڈ میں جھانک آؤں۔ روم

نمبر تائن کی پیشکش مجھے شے بہت مانوس ہو گئی ہیں۔ جاتے جاتے دیکھ لوں۔“ وہ سر پہ سیاہ اسکارف ورنسٹ کرتی ڈیوٹی روم سے باہر نکلی۔

اس کی نرم دلی اور ہمدرد فطرت کے باعث اکثر کو لیک اسے پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمزہ کو تو وہ اور ہی درنگ میں بھانسنے لگی تھی، اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔ سم وارڈ میں مریضوں کو دیکھنے کے بعد وہ رانداری میں بنے آخری کمرے کا دروازہ کھیل کر اندر داخل ہوئی۔ یہ روم نمبر پائیس تھا۔ اسری کے ساتھ دو نرسیں بھی تھیں۔

”ہاں بھی، کیسے ہیں آپ؟ کچھ امپروومنٹ محسوس کر رہے ہیں؟“

اسری نے مریض کے سرہانے کھڑے ہوتے۔ اس کا نتیجہ دو سرے روز بڑے تلخ انداز میں نکلا۔ ہوئے خوش اخلاقی سے پوچھا اور پھر اس کی کیس فائل۔ سینئر ڈاکٹر افتخار اور سرجن نصیر خان نے اسے سنت کا جائزہ لینے لگی۔ دوسری طرف دنیا جہان کا شوق انداز میں ڈانٹا۔ آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

”پہلے تو نہیں مگر اب کافی بہتر محسوس ہونے لگا۔“

”زیاد آرام سے بولا۔ اسری نرس سے کچھ کہہ کر نظر آپ کو صرف اپنے فرض سے مطلب ہوتا رہی تھی۔ اس کی بات کو دھیان سے نہ سن سکی۔“

”فریحہ! آپ ان کی ڈرنگ دوبارہ کریں، اس میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔“ پھر اس نے خود زیاد کے ٹوٹے بازو اور پسلیوں کا جائزہ لیا۔

”آپ تو بہت باحوصلہ اور مضبوط ہیں۔ سرجن افتخار احمد آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“ اسری نے اس کے پیوں میں جکڑے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

تین دن پہلے وہ شدید زخمی حالت میں یہاں آیا تھا۔ اس کی تین پسلیاں اور بایاں بازو ٹوٹ چکا تھا۔ گردن کے آس پاس کا نازک حصہ بھی زخمی تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اسری کو دیکھا تھا۔ اسے وہی اٹینڈ کر رہی تھی۔ کوئی کوئی لمحہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اچھا بھلا انسان ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ شدید زخمی حالت میں ہونے کے باوجود زیاد چوہدری کی زندگی میں بھی یہ لمحہ آچکا تھا۔ اسے ڈاکٹر اسری کی مسیحا کی اچھی لگی تھی۔ زیاد نے آنکھوں سے پھلکتی وارفتگی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اسری کی آج پھر نائٹ ڈیوٹی تھی۔ گزشتہ تین چار روز سے روم نمبر ۱۱ میں مریض نے اسے عاجز کر کے رکھ دیا تھا۔ نرسیں اور دیگر اسٹاف دبی دبی آواز میں اسی کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے۔ آج اس کا پکا ارادہ تھا کہ کسی صورت میں بھی روم نمبر ۱۱ کے قریب بھی نہیں بھٹکے گی۔ اس شخص کے ہیکل جملے اور نگاہیں کم از کم اب اس کے لیے ناقابل (بزدلانت) رہیں۔ رات ڈیوٹی کے دوران وہ اپنے ارادے کے مطابق روم نمبر ۱۱ میں نہیں گئی اور

اس کا نتیجہ دو سرے روز بڑے تلخ انداز میں نکلا۔ سینئر ڈاکٹر افتخار اور سرجن نصیر خان نے اسے سنت کا جائزہ لینے لگی۔ دوسری طرف دنیا جہان کا شوق انداز میں ڈانٹا۔ آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

”پہلے تو نہیں مگر اب کافی بہتر محسوس ہونے لگا۔“

”زیاد آرام سے بولا۔ اسری نرس سے کچھ کہہ کر نظر آپ کو صرف اپنے فرض سے مطلب ہوتا رہی تھی۔ اس کی بات کو دھیان سے نہ سن سکی۔“

”فریحہ! آپ ان کی ڈرنگ دوبارہ کریں، اس میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔“ پھر اس نے خود زیاد کے ٹوٹے بازو اور پسلیوں کا جائزہ لیا۔

”آپ تو بہت باحوصلہ اور مضبوط ہیں۔ سرجن افتخار احمد آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“ اسری نے اس کے پیوں میں جکڑے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

تین دن پہلے وہ شدید زخمی حالت میں یہاں آیا تھا۔ اس کی تین پسلیاں اور بایاں بازو ٹوٹ چکا تھا۔ گردن کے آس پاس کا نازک حصہ بھی زخمی تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اسری کو دیکھا تھا۔ اسے وہی اٹینڈ کر رہی تھی۔ کوئی کوئی لمحہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اچھا بھلا انسان ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ شدید زخمی حالت میں ہونے کے باوجود زیاد چوہدری کی زندگی میں بھی یہ لمحہ آچکا تھا۔ اسے ڈاکٹر اسری کی مسیحا کی اچھی لگی تھی۔ زیاد نے آنکھوں سے پھلکتی وارفتگی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اسری کی آج پھر نائٹ ڈیوٹی تھی۔ گزشتہ تین چار روز سے روم نمبر ۱۱ میں مریض نے اسے عاجز کر کے رکھ دیا تھا۔ نرسیں اور دیگر اسٹاف دبی دبی آواز میں اسی کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے۔ آج اس کا پکا ارادہ تھا کہ کسی صورت میں بھی روم نمبر ۱۱ کے قریب بھی نہیں بھٹکے گی۔ اس شخص کے ہیکل جملے اور نگاہیں کم از کم اب اس کے لیے ناقابل (بزدلانت) رہیں۔ رات ڈیوٹی کے دوران وہ اپنے ارادے کے مطابق روم نمبر ۱۱ میں نہیں گئی اور



ہوں۔" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا پھر اس نے بڑی شرافت سے اسری کی موجودگی میں نرس سے انجکشن لگوا دیا اور میڈسن لی۔

خلاف توقع اس کے رد عمل کو دیکھ کر اسری بہت حیران ہوئی، کیونکہ اپنے تیور اور مزاج کی بدولت وہ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں لگ رہا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اس نے سکون کا سانس لیا۔ چند روز بعد وہ ڈسچارج ہو کر چلا گیا۔

\*\*\*

بڑے ابا پھر آئے ہوئے تھے۔ اب کی بار ان کے ساتھ بڑی امی بھی تھیں۔ اسری آج گھر پہنچی۔ رابعہ حسب معمول کچن میں تھی۔ اسری اس کے پاس چلی آئی۔

"ہاشم! تم نے کہیں نہ کہیں بیٹیوں کی شادی کرنی ہی سے نا پھر تمہیں اپنے جانے پہچانے لوگوں میں شادی کرنے پہ کیا اعتراض ہے۔ اس طرح تم اپنے برکھوں کی روایات سے قریب تر رہو گے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، بڑا بھائی ہوں۔ تمہارے باپ کی جگہ ہوں، غلط نہیں سوچوں گا۔ تم خود بیمار رہتے ہو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو، تمہارے بعد رابعہ اور اسری کا کیا بنے گا، کون ان کے سر پہ ہاتھ رکھے گا۔" شہباز انہیں نفسیاتی ہتھکنڈوں سے پر جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ان کی توقع کے عین مطابق ہاشم صاحب کے چہرے پہ تذبذب کے اثرات واضح ہونے لگے تھے۔

"بھائی جان! رابعہ کی متنی ہو چکی ہے اور اسری کا ہاؤس جاب ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی اس بارے میں سوچنے سے معذور ہوں۔" انہوں نے رک رک کر جیسے اپنی مجبوری بیان کی مگر مزہ بھر بھی خاطر میں نہیں لائے۔

اسری نے کہا: "مگنی ٹیوٹ بھی رہ سکتی ہے۔" وہ مکمل سراسیمہ ہو گیا۔ ہاشم صاحب نے اس کی بات کو غور سے نہ سنا۔ اس نے کہا: "یہ کہہ کر وہاں رنگا ہون سے دیکھا۔"

"ہم زبان دے کر پھرتے نہیں ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے تو شہباز ان کی طرف جھک آئے۔ "میں بھی زبان دے کر پھروں گا نہیں۔ رابعہ نہ سہی، اسری ہی سہی۔" ان کے لبوں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ پہ تحکم کی مر لگی ہوئی تھی۔

"ہاں ہاشم! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سلطانہ خاتون نے شوہر کی حمایت ضروری سمجھی۔ وہ خود کو اس محاذ پہ بالکل تنہا محسوس کر رہے تھے۔ سینے میں بائیں طرف پھرا نہیں درد اور ٹھٹھن کے ساتھ بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

\*\*\*

"اسری! آج فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر حمزہ نے اچانک ہی اس سے سوال کیا تو وہ چونک گئی۔ ڈیوٹی روم میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر حمزہ واحد شخص تھے جنہوں نے روم نمبر ۱۱ میں کے مریض کے معاملے میں اس کی حمایت کی تھی۔ اسری ان کی ممنون تھی، بلکہ اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر حمزہ نا محسوس انداز میں اس کی چھوٹی موٹی کئی مشکلات حل کر چکے تھے۔ مریضوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت ہمدردانہ ہوتا تھا۔

پھر چائے پینے کے دوران ڈاکٹر حمزہ نے حیران کن سوال کیا۔

"اسری! اگر میں اپنے گھر والوں کو آپ کے گھر بھجواؤں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟" وہ چائے پینا بھول کر پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھنے لگی۔ حمزہ مسکرائے تو اس نے ہڑبڑا کر نظریں جھٹکائیں اور ٹیبل کی سطح خواخوہ ناخنوں سے کھرپنے کی کوشش کرنے لگی۔

اسری نے جواب نہیں دیا؟ "حمزہ اس کی اس کیفیت سے حفا اٹھا رہے تھے۔

اسری نے جواب میرے ابو دیں گے۔" یہ کہہ کر وہاں رنگا ہون سے دیکھا۔

ہوئے انہیں سات سال گزر چکے تھے۔ گھر والوں کی شہر بھر کی نرسہاں چھاننے کے بعد خریدتے تھے۔ طرف سے ان پہ شادی کر لینے کے لیے بہت دباؤ تھا۔ مگلوں پہ پینٹ رابعہ اپنی نے کیا ہے۔ اور نہ جاسن کا بیڑ حمزہ نے بارہا اس سے حال دل آپ دیکھ رہے ہیں نا، یہ ابانے چھ سال پہلے لگایا تھا۔ کہنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسری کا لیا دیا رویہ آڑے آگیا۔ آج ہمت کر کے انہوں نے یہ مشکل مرحلہ بھی گزرے۔

کر لیا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اسری کے والد اس کے پرویزل کو رد نہیں کریں گے۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شرافت و نجابت میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔

حمزہ کے والدین نے بڑی خوبصورتی سے اپنا مدعا ہاشم گیلانی کے رویہ گوش گزار کیا۔ انہوں نے رسا سوچنے کی مہلت مانگی۔ وگرنہ دل سے وہ مکمل طور پہ راضی تھے۔ ڈاکٹر حمزہ سے تین چار بار پہلے بھی ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ ان کی شرافت اور مضبوط کردار کے مداح تھے۔ درحقیقت وہ اسری کے لیے ایسے ہی شریک سفر کے متنی تھے۔ بیٹھے بٹھائے ان کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ جلد از جلد وہ رابعہ اور اسری کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہ رہے تھے کیونکہ شہباز گیلانی کے ارادے انہیں کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ سارا خاندان شہباز کا ہم نوا تھا، وہ کہاں تک اکیلے سب کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

اسری نے ان کی خواہش پہ سر جھکا دیا تھا۔ حمزہ ایک آئیڈیل مرد تھے۔ پروقا، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے اخلاق و کردار کے مالک۔ جب دھیمے لہجے میں بولتے تو بے اختیار جی چاہتا، بس وہی بولتے رہیں اور باقی آوازیں معدوم ہو جاتیں۔

حمزہ نے اس رات پہلی بار اسری سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ وہ ڈنر پہ ان کے گھر پہنچے۔ "اسری بیٹی! حمزہ کو گھر دکھاؤ۔" ہاشم نے کہا تو وہ حمزہ کو لے کر باہر لان میں آگئی۔ "یہ تمام پودے میں نے لگائے ہیں۔ یہ بوگن ویلیا اور سدا بہار کی باڑ کی دیکھ بھال صرف اور صرف میرا کمال ہے۔ یہ رنگ برنگے گلاب کے پھولوں کے پودے میں نے آپ کی ساتھ

ہم نے چاند سے چاندنی راتوں سے بارش کی آواز سے جاتی بہاروں کے موسم میں کھلنے والے جنگلی پھولوں سے عشق ہے۔ ہاں سردیوں کی بارش جانے کیوں مجھے اداس سا کر دیتی ہے۔ کچھ بکھری سٹی یادوں کے دروا کر دیتی ہے۔ ایسے میں اکثر اپنے کمرے میں بیٹھا کھڑکیاں کھول کر میں بارش کی ٹپ ٹپ میں بہت کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اقبال بانو کی غزل داغ دل ہم کو یاد آنے لگے اور نیو نور کی آواز میں گالی گئی یہ نظم "۲" اے عشق ہمیں برباد نہ کر، بہت پسند ہیں۔ ریلیکس موڈ میں، میں اکثر غلام علی اور اے نیر کو سنتا ہوں۔ فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا مجھے ازب ہو چکی ہے۔ منشا یاد کے افسانے میرے دل کو چھو

143



ٹوٹ جاتی۔

”رابعہ! میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ بڑے ابا ہیں۔ چچا ہیں۔ میرا پورا خاندان ہے پھر حمزہ بھی تو ہیں۔“ رابعہ نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

بڑے ابا اور دونوں چچا ابھی تک یہیں تھے۔ سوئم کے بعد شہباز گیلانی نے ان دونوں بہنوں سے بات کی۔

”تم میرے ساتھ گاؤں چلو وہاں تعزیت کرنے والوں کا مانتا بندھا ہوا ہے۔ وہ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تمہارے دکھوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔“ شہباز نے رابعہ اور اسری کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

”بھلا یہاں اب کیا رکھا ہے۔ ہاشم تو ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا کبھی بھی نہیں۔“ ان کے ساتھ رابعہ بھی پھروٹے لگی۔ مگر اسری نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”بڑے ابا! اگر میں گاؤں چلی گئی تو میرے ہاؤس جاب کا کیا بنے گا ویسے بھی اب صرف تین ماہ رہ گئے ہیں۔ میں نے پہلے ہی کافی چٹشیاں کر لی ہیں۔“ اس کا لہجہ بے تاثر مگر برا اعتماد تھا۔

”تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ چلو ایسے کرو۔ دو تین دن کے لیے گاؤں آؤ۔ پھر واپس چلی آنا۔ چالیسویں تک چھٹی کے دن آتی جاتی رہنا۔ یہاں میں تمہارے پاس زرین اور ایک ملازم کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اضافی چوکیدار میں گاؤں سے بھجوا دوں گا تاکہ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔“ ان کا بھاری ہاتھ ابھی تک اسری کے سر پہ دھرا تھا۔ اس نے ان کی کسی بات سے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔

رابعہ ان کے ساتھ گاؤں چلی گئی۔ شہباز نے اپنے وعدے کے مطابق ایک چوکیدار ملازمہ اور زرین کے ساتھ ایک بڑے قابل اعتماد اور وفادار معتمد خاص کی سفیان کو بھی بھیجا تھا جو اسری کی حفاظت اور گھر کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ بقول شہباز کے کہ ”ایسا اسری کی تنہائی کی خیال سے کیا گیا تھا۔“

وہ سب کو اس گھر میں برداشت کرنے پہ مجبور تھی۔ زرین ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتی جو نہی وہ ہاسپٹل سے آتی۔ زرین اسے گھیر کر بیٹھ جاتی۔ اپنی کچھ خامیوں کے باوجود اسری کو وہ اچھی لگنے لگی تھی۔

زرین نے اسے حویلی، گاؤں اپنے رشتہ داروں اور اپنی والدہ کے بارے میں ڈھیروں باتیں بتائی تھیں۔ زرین کا خالص انداز اسری کو اچھا لگا تھا بلکہ اس نے تو اسری کو اپنے ایک بہت ہی خاص راز میں بھی شریک کر لیا تھا۔

”اسری! وہ بہت اچھا ہے۔ قدر بے حدی اور خود سر سا۔ پتا ہے سفید حویلی والے جلد ہی ہمارے خاندان سے ایک نیا رشتہ جوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں شاید اس طرح دونوں خاندانوں کے مابین دشمنی کی فصیل گرائی جاسکے جو برس برس سے بہت بلند ہو رہی ہے اگر ایسا ہو جائے تو شاید میری آرزو بھی پوری ہو جائے کیونکہ وہ دوبار اپنے بڑوں کے ساتھ ہماری حویلی آچکا ہے۔ ہمارے مرد بھی اس کی عیادت کو گئے تھے۔ چند ماہ پہلے اس کا بہت سیریس ایکسڈنٹ ہوا تھا۔“

”وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسری بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔

”اگر وہ تمہیں نہ ملے تو پھر تم کیا کرو گی۔ مثال کے طور پر اگر دونوں خاندانوں کی صلح نہ ہوئی تو پھر؟“

”ایسے نہ کہو کیونکہ ابا جان کو صلح کرنی ہی پڑے گی۔ اگر اس کے لیے مجھے اپنی جائیداد بھی چھوڑنی پڑی تو میں چھوڑ دوں گی۔ ویسے آجکل اسی بارے میں بحث چل رہی ہے چچا جان کا خیال ہے کہ اگر ہم نے اپنی بیٹی ملکوں کو دے دی تو اس میں توہین کا پہلو ہے۔ مجھے تو اس میں توہین کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ مجھے یہ خواہ مخواہ اس کی خود ساختہ پابندیاں پسند نہیں ہیں۔“ زرین کے انداز سے بغاوت ظاہر ہو رہی تھی۔

”تم میں جو صلہ ہے ان پابندیوں سے نکرانے کا؟“ اسری نے یونہی پوچھا تو وہ جواب میں پھٹ پڑی اور

ایک لمبی سی تقریر جھاڑ دی۔

حمزہ روز باقاعدگی سے اسری کو فون کرتے تھے۔ چاہے ہاسپٹل آئے یا نہ آئے مگر دو روز سے نہ وہ ہاسپٹل آ رہے تھے اور نہ فون کر رہے تھے۔ ان کا موبائل بھی بند تھا۔ رات اس نے تین چار بار حمزہ کو فون کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ زرین خلاف توقع جلدی سو گئی تھی وہ ٹھکن کے باوجود کافی دیر تک جاگتی رہی۔

چالیسواں ہو چکا تھا۔ رابعہ دکتے دل اور برستی آنکھوں کے ساتھ روانگی کی تیاری کر رہی تھی۔

”اسری! جو نہی تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہوا۔ میں خاور سے کہہ سن کر پاکستان کا چکر لگانے کی کوشش کروں گی۔ واپس آکر میں حمزہ بھائی کے گھر والوں سے بات کروں گی۔ اب اس کام میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔ جانے کیوں میرا دل جانے کو نہیں چاہ رہا یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہو جائے گا مگر بڑے ابا نے مجھے بہت تسلی دی ہے۔ وہ تمہاری خبر گیری کرتے رہیں گے۔ اور بڑی امی کو ادھر ہی چھوڑ دس گے تمہارے پاس۔ مگر اس کے باوجود کوئی بات مجھے ٹھنک رہی ہے۔ اسری! کوئی بھی پریشانی کی بات ہو تو فوراً مجھ سے رابطہ کر لینا۔ بس دو ڈھائی ماہ کی بات ہے۔ یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔ اسے کمزور لہجے میں تسلی دے رہی تھی۔

”آپ! کچھ بھی نہیں ہو گا۔ آپ بالکل پریشان مت ہوں اور یہ روٹی صورت بنا کر خاور بھائی کے پاس مت جائیے گا۔ خواہ مخواہ ڈر جائیں گے۔“ اسری نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی تو رابعہ آنسوؤں کے بیچ مسکرانے لگی۔

”اسری! تم بہت بدل گئی ہو“ اچانک ذمہ دار اور بڑی بڑی سی لگنے لگی ہو۔ مضبوط اور باہمت سی۔ ورنہ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی کہ تمہارا کیا

دیکھنے کا؟“

”بھلا کیا بننا؟ اب ان فضول سوچوں میں مبتلا نہ رہو۔ کھائیے۔ جاؤں اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر میک اپ کریں۔ سات بجے آپ کی فلائٹ ہے۔“ اسری نے ناچول خوشگوار کرنے کی جو کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب رہی۔ رابعہ کپڑے بدلنے چلی گئی۔ وہ تیار ہو کر اکر کے سے باہر آئی تو اسری نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اب لگ رہی ہیں نا میری آپلی۔ بجلیاں گر رہی ہیں۔“ رابعہ جھینپ سی گئی۔ اتنے میں فیض نے حمزہ اور اس کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع دی تو اسری رابعہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”کیسی ہیں آنٹی آپ؟“ اسری حمزہ کی والدہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”بس ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولیں۔ رابعہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی اور دھیمی آواز میں اسری اور حمزہ کی شادی کے بارے میں بات کرنے لگی۔

”میں اسری کے ہاؤس جاب کے بعد آؤں گی تب تک آپ بھی تیاری مکمل رکھیں۔“ اس نے سامنے صوفے پر بیٹھے حمزہ کی طرف دیکھا۔ رابعہ کو محسوس ہوا جیسے وہ مقطرب سے ہو رہے ہیں۔ اسری اٹھ کر باہر آگئی۔

”رابعہ! اصل میں اگلے ماہ میں انگلینڈ جا رہا ہوں وہاں سے واپسی پہ سوچوں گا۔“ ان کے لہجے میں لا تعلقی تھی۔

”آپ کب تک آئیں گے؟“

”پتا نہیں۔“ انھوں نے کمال بے نیازی سے کہا تھا۔ رابعہ کو ان کا یہ انداز بہت برا لگا۔ حمزہ کی والدہ اس دوران بالکل خاموش رہیں جیسے اس قصے میں ان کا کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں شہباز گیلانی، سلطانہ خاتون اور زرین کے ساتھ آگئے تھے۔ جانے سے پہلے رابعہ نے ایک بار پھر بڑے



ابا سے اسری کا خیال رکھنے کی درخواست کی تھی۔

اسی روز شام کو وہ گاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔

راستے میں شہباز اسے گاؤں کے بارے میں بتاتے

بڑے بے رنگ سے شب و روز تھے اگر ہاسپٹل کی مصروفیت نہ ہوتی تو اسری شاید تنہائی سے گھبرا کر کچھ کر بیٹھتی۔ سلطانہ خاتون یعنی بڑی امی بھی اس کے پاس تھیں مگر کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا وہ ان کی کڑی نگرانی میں ہے۔

خدا خدا کر کے اس کا ہاؤس جاب مکمل ہوا۔ حمزہ اس سے پہلے ہی انگلینڈ کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ریماء اسری سے ملے تھے۔ مگر ایک جملہ بھی انہوں نے تسلی کا نہیں کہا تھا۔

وہاں پہنچنے کے بعد اس نے سرسری سا خیریت کا فون کیا اور بس۔ وہ بے چین سی تھی۔

ایک شام وہ واپس آئی تو سلطانہ خاتون اپنا سامان رکھوا رہی تھیں۔

”بڑی امی! کہاں کی تیاری ہے؟“

”واپس جا رہی ہوں۔ تم بھی تیاری کرو۔ دراب کی شادی ہے۔ جو جو ضروری چیزیں رکھنی ہیں رکھ لو کیونکہ ہفتہ دس دن تو تمہیں وہاں لگ ہی جائیں گے۔ تم بہن ہو۔ دراب کی خوب خوشیاں منانا سب کے ساتھ۔ ذرا حویلی میں جا کر دیکھنا تو سہی، کتنی رونق اور ہلا گلا ہوگا۔ سب بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم ہاشم کی بیٹی ہو ہمارا خون۔ شہباز کئی بار تمہارے لیے روئے ہیں۔ اس خالی ڈھنڈا گھر میں کب تک رہو گی۔ گاؤں آؤ۔ دیکھنا تمہیں کتنی اپنائیت اور محبت ملے گی۔“ وہ ساتھ ساتھ اسری کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے بڑی امی! لائف میں تھوڑی تبدیلی تو

آنا ہی چاہیے میں خود بور ہو رہی تھی جب تک کہیں جاب ملتی ہے تب تک تھوڑی انجوائے منٹ ہی رہتی رہتی اب اس کے اتنے جلدی مانا جائے پھر سلطانہ خاتون مطمئن ہو گئیں۔

پارو اس سے پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ طبعاً بہت ساہ اور بچ بولنے والی۔

پارو ماتھے پہ ہاتھ مار کر مسکرا دی۔

”دراب بھائی کی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی ہے شادی اتنی جلدی کیسے ہوگی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اسری آپ! وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔

پارو اس سے پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ طبعاً بہت ساہ اور بچ بولنے والی۔

اسری کا جی گھبرانے لگا۔

رات کے کھانے کے لیے اسے ملازمہ بلانے آئی تو وہ مرے مرے قدموں سے ڈانگ ہال تک پہنچی۔ وہ پہلے بھی حویلی آچکی تھی مگر اس وقت اس نے مینوں کے رویے کو جاننے سے احتراز برتا تھا۔ دوسرے باپ کی موت کا زخم تازہ تھا کسی دوسری طرف اس کی نگاہ گئی ہی نہیں۔ مگر آج کافی باتیں واضح ہونے لگی تھیں۔ بڑے ابا سمیت باقی سب کا لیا دیا انداز لڑکیوں کی ہچکچاہٹ پارو کی خوش اخلاقی سلطانہ خاتون کی کڑی نگاہ۔ ان سب کے پس پردہ جانے کون سے عوامل کار فرما تھے۔

”کیا ہے“ میں فوراً واپس جاؤں گی اس اجنبیت بھرے ماحول میں میں مزید نہیں رہ سکتی۔ ابھی بڑے ابا سے کہتی ہوں مجھے واپس بھیجوا دیں۔“ اس نے اپنی سوچ پہ فوراً عمل در آمد بھی کر ڈالا۔ بڑے ابا نشست گاہ میں سلطانہ خاتون کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اسری کی بات یہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اب تم واپس نہیں جاؤ گی کم از کم اس وقت تک جب تک میرے مطالبات نہیں مان لیتیں تم“ اس حویلی سے باہر کی زندگی تمہارے لیے خواب ہے، صرف خواب۔ میں نے اب تک تم سے بہت نرمی کا سلوک کیا ہے صرف مجبوری کی وجہ سے۔ یہ اب تم پہ منحصر ہے کہ تم اپنے ساتھ کسی قسم کا سلوک پسند کرتی ہو۔ آج سے خود کو اپنے کمرے تک محدود سمجھنا۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ اس کی نوبت نہ آئے مگر تم تو بہت جلد گھبرا گئی ہو۔“

آج ان کے چہرے سے خوش اخلاقی کا مصنوعی نقاب مکمل طور پر اتر چکا تھا۔

آپ اس رویے کا سبب نہیں بتائیں گے میں آپ کی کوئی بات بھی نہیں مانوں گی۔“

”کیا کہا۔ نہیں مانو گی؟۔ شہباز گیلانی کی کبھی کسی نے حکم عدولی نہیں کی ہے، میری لغت میں ناں کا لفظ نہیں ہے۔ اب کی بار میں شکست قبول نہیں کروں گا۔“

شہباز گیلانی اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے پر غضب انداز میں گھور رہے تھے۔ پہلی بار سچ سچ پہلی بار اسری کو بڑے ابا سے انتہائی خوف محسوس ہوا، وہ اس کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”جاؤ اپنے کمرے میں، ٹھنڈے دل سے ہر چیز کے بارے میں غور کرو۔“

”بڑے ابا کس چیز کے بارے میں غور کروں۔“ اس نے کچھ سوچ کر نرمی سے پوچھا۔

”ہاں۔ اب کچھ معقول بات کی ہے تم نے، اصل میں میں نے ملک انور کے بیٹے کا رشتہ تمہارے لیے منظور کر لیا ہے۔“ انہوں نے بالکل عام سے انداز میں بات کی۔ حیرانی در حیرانی، تمہ در تمہ انکشافات، وہ شدید رہ گئی۔

”بڑے ابا! ابو نے اپنی زندگی میں ہی میرا رشتہ ڈاکٹر حمزہ سے طے کر دیا تھا۔ آپ کو تو سب کچھ پتہ ہے۔ وہ بمشکل بولی تھی۔“

”وہ رشتہ ہاشم نے طے کیا تھا اور یہ میں کر رہا ہوں۔ سمجھیں۔ تم آئندہ میرے سامنے اس کا ذکر مت کرنا اگر حمزہ سے تمہارا رشتہ طے تھا تو وہ انگلینڈ جا کر کیوں بیٹھ گیا ہے۔ ہونہ بزدل۔ گیدڑ کی اولاد۔ وہ آئندہ اپنی شکل بھی تمہیں نہیں دکھائے گا۔ اس کا خیال دل سے نکال دو۔“

اسری نے خود کو بے حد بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس میں طویل وعریض کمرے کی ہر شاہانہ چیز جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ شہباز گیلانی نے اس کا موبائل فون بھی اس سے لے لیا تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ

منقطع ہو چکا تھا۔ کاش وہ کسی طرح جو ادا نکل اور رابعہ، آپ سے رابطہ کر سکتی۔ اس کی یہ خواہش حیرت انگیز طور پر پوری ہو گئی۔ رات وہ بستر پہ لیٹی اس اب بھی ہونی صورت حال پہ غور کر رہی تھی تو شہباز گیلانی دبے قدموں سے اس کے کمرے میں آئے وہ انہیں دیکھ کر زرد پڑ گئی اور دوپٹہ درست کرتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ان کے ہاتھ میں اسری کا موبائل فون تھا۔

”یہ لو فون اور جو اد لطیف کا نمبر ملا کر کہو کہ تم گاؤں میں ہو اور فی الحال تم نے فیصلہ کیا ہے کہ ادھر ہی رہو گی۔ یہی بات تم رابعہ سے بھی کہو۔ امید ہے میری بات پہ عمل کرو گی اگر نہ کیا تو اپنا ہی نقصان ہے تمہارا۔ یہ مت سمجھنا کہ کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ میں اس کا حشر خراب کروں گا۔“ انہوں نے وارننگ دے کر فون اسے تھمایا۔

پھر انہوں نے جیسا کہا اس نے ویسا ہی کیا۔ ”خاصی سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے تم نے۔“ نہ جانے انہوں نے اسے سراہا تھا یا طنز کیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

”میرے خدا! میں کیا کروں۔“ اس نے سر کے بال بے دردی سے مٹھی میں جکڑے۔ چند گھنٹے میں اس کے ساتھ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ایک خود مختار پر اعتماد لڑکی کے بجائے وہ قیدی بن گئی تھی اور قیدی بھی بڑے ابا جیسے دو چہرے رکھنے والے دشمن کی۔

اسے سارے ددھیال کی بے حسی پہ حیرت ہو رہی تھی۔ بڑے ابا کے سوا کسی نے اس کے کمرے میں آکر جھانکا تک نہ تھا۔ گویا وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو، بے جان چیز ہو۔ ان کے سامنے ہی تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ گویا سب کی مرضی سے یہ کام ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر سفیان کرسی ڈالے بندوق تھام کر یوں بیٹھا تھا جیسے اندر کوئی خطرناک مجرم بند ہو۔ شہباز نے سلطانہ خاتون کے سوا ہر کسی کا داخلہ حویلی کے اس حصے میں ممنوع قرار دیا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کی پریشان سوچیں۔

باہر سناٹا گہرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اسری رونا نہیں چاہتی تھی۔ لاکھ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ اس وقت اسے ہاشم صاحب بری طرح یاد آنے لگے۔ ٹھنڈی گھنی میٹھی چھاؤں جیسے ہاشم گیلانی جو اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ (م) کافی دیر وہ دنگر فٹہ سی بند خال میٹھی رہی بالآخر غیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔

صبح نوجوان ملازمہ ناشتہ لے کر آئی۔ اسری نے بڑے ایک طرف سر کا دی۔ غمی ابھی تک اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے چونکا نگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کلن دروازے کی طرف دگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر اسری کے پاس آگئی اور انتہائی مدہم آواز میں بولی۔

”اسری بی بی! زرین بی بی کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ابا کی بات نہیں مانی ہے اگر آپ نے ان کی نکلح والی تجویز مان لی تو ساری زندگی ذلت کی چکی میں پستے ہوئے گزاریں گی۔“

وہ جس طرح آئی تھی اتنی ہی تیزی سے چلی گئی۔ اسری نے سامنے بڑا ناشتہ دیکھا۔ اسے بالکل بھی بھوک نہیں تھی۔ مگر دل کو تھوڑی ڈھارس ہو گئی تھی کہ کوئی تو اس کا ہمدرد ہے۔ وہ پھر کوشی اس کے لئے کھانا لائی تو اس نے آہستہ اور محتاط آواز میں اس سے کہا۔

”تم زرین بی بی سے کہو۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

غمی نے نفی میں سر ہلایا اور نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

”جب تک آپ کا نکاح نہیں ہو جاتا یہ پابندی برقرار رہے گی۔“ وہ شکوہ کنناں نگاہوں سے غمی کو دیکھ کر رہ گئی۔

اس قید سے نکلنے کے لیے کیا وہ بڑے ابا کے ساتھ سودے بازی کر لے یا پھر زرین کی بات مان کر انکار

کر کے ہمیشہ کے لیے یہ اندھیرے اور قید خرید لے۔  
میرے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے پھر میں  
کس برتنے پہ لڑوں۔ زرین بھی تو میری طرح کمزوری  
لڑکی ہے۔ بھلا وہ میری کیا مدد کر سکتی ہے۔ ”بڑے ابا  
صرف اور صرف اس شادی پہ مجبور کرنے کے لیے تو  
یقیناً اسے یہاں نہیں لائے ہوں گے۔ اس کے پیچھے  
یقیناً کوئی مقصد ہو گا پھر حمزہ کا آخری ملاقات میں سرد  
اور رسمی سا رویہ بڑے ابا کا حقارت سے اس کا ذکر  
کرنا۔ یقیناً حمزہ کے اس رسمی رویے کے پس پردہ بڑے  
ابا کا ہاتھ ہو گا۔ حمزہ کی یاد آتے ہی اس کے دل میں  
ہوک سی اٹھی۔ ڈاکٹر حمزہ بارش خوشبو اور چاند کی باتیں  
کرنے والے۔ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ۔ اسے  
ایک ٹک دیکھنے لگنے جنہوں نے اسری کی سالگرہ پہ  
اسے اس کے پسندیدہ شاعر کی کتابوں کا سیٹ گفٹ دیا  
تھا۔ جانے کیوں وہ انگلیڈ چلے گئے تھے۔

بھلا کیا تھا اسری کے پاس چند یادوں کچھ  
مسکراہٹوں اور ایک ادھورے کس کے سوا۔ وہ حمزہ  
کے تصورات کے ساتھ بہت دور تک تو نہیں گئی تھی  
مگر وہ اس کی زندگی میں آئے تو تھے مختصر عرصے کے لیے ہی  
سہی وہ حقیقت تھے مگر اب خواب بننے جا رہے تھے موم  
اور دھندلا سا خواب جو آنکھ کھلنے پہ یاد ہی نہیں رہتا۔  
کتنے کمزور نکلے تھے بڑے بڑے دعوے کرنے والے  
وہ کس کس کا افسوس کرتی فی الحال تو موجودہ حالات ہی  
اس کے لیے درد سربے ہوئے تھے۔

دوپہر کا کھانا بھی یونہی رکھا رہا۔ رات میں اس نے  
صرف دو لوالے کھائے۔ نقاہت کے سبب اس کا ذہن  
کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

اکلی صبح بھی ناشتہ لے کر آئی تو اسری کو ترحم آمیز  
نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کب تک نہیں کھائیں گی؟“ کھانسی خوب  
ڈٹ کر کھائیں۔ ”زرین کی بی بی نے کہا ہے آپ مایوس  
مست ہوں وہ جلد ہی کوئی راستہ نکال لیں گی۔“ وہ  
انتہائی آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔ اس کے  
”جی“ اسری جیسے مرتے مرتے جی اڑتی جی رہی تھی۔  
اس کے ساتھ بعد میں آیا۔

تسلی دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ دبایا۔  
اس نے بڑی رغبت سے ناشتہ کیا۔ پیٹ میں غذا  
اتری تو ذہن بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ اس  
نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ تین روز  
سے اس کے جسم پہ وہی پرانا لباس تھا۔ الجھے بال جو بے  
ترتیبی سے اس کے گرد بٹھرے ہوئے تھے۔ بے رونق  
چہرہ زرد رنگت، آنکھوں کے گرد چلتے۔ صرف تین دن  
کے اندر اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ بے رونق سی  
ہنسی اس کے لبوں پہ آ کے دم توڑ گئی۔ ہاتھ روم میں  
جا کر اس نے از سر نو اپنا منہ ہاتھ دھویا۔ کنگھی کی اور  
ساتھ لائے کپڑوں میں سے ایک سوٹ نکل کر پہنا۔  
اس کے بعد کارپٹ پر ہی بیٹھ کر دل کی گہرائیوں سے  
دعا مانگی۔ ”اے اللہ میرے لیے جو بہتر ہو وہی کرنا۔“  
ایک نئی توانائی جیسے اس کے جسم و جاں میں اچانک  
لو کے ساتھ شامل ہو کر دوڑنے لگی تھی۔ غمی چائے  
لے کر آئی تو اس نے بڑے ابا سے بات کرنے کی  
خواہش کا اظہار کیا۔

پانچ منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھے۔  
”بڑے ابا! مجھے آپ کے مطالبے منظور ہیں بس یہ  
خیال رہے کہ رابعہ آپنی خوش رہیں۔“ اس کا لہجہ بہت  
باوقار تھا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے پتہ تھا تم نادانی سے  
کام نہیں لو گی۔“ اچانک ان کا لہجہ بدل گیا پہلے کی طرح  
وہی محبت لٹاتا لہجہ اور الفاظ۔ مگر اسری ہر جذبے سے  
عاری ہو کر آئندہ ہونے والے سود و زیاں کے بارے  
میں سوچ رہی تھی۔

سفیان بدستور اس کے کمرے کے دروازے پہ  
متعین تھا۔

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ حویلی میں رونق اور چہل  
پہل نظر آنے لگی تھی۔ سفید حویلی سے ملک انوار  
ملک واجد اور ملک اسجد کے ساتھ ان کی بیویاں ملک  
واجد کی دونوں بیٹیاں اور اماں جی بڑے فخر اور خوشی سے  
سیما زنگیلانی کے پاس آئے دو لہما فخر اور دوسرے دو کزنز  
”جی“ اسری جیسے مرتے مرتے جی اڑتی جی رہی تھی۔  
اس کے ساتھ بعد میں آیا۔

اسی کا انتظار تھا نکاح خوان اور مسجد کے پیش امام  
صاحب کے ساتھ دوسرے سب مہمان دو لہما کی راہ  
تک رہے تھے۔

”مبارک ہو!“ فخر نے سب سے پہلے گلے ملتے  
ہوئے اسے نکاح کی مبارکباد دی اور بڑا سائنڈ پورا  
کھلا کر ہی چھوڑا۔

اندر اسری کے پاس دائیہ اور تانیہ تھیں جو ایک  
ایک زاویے سے اسری کا شکست خوردہ سر لپا کمرے  
میں تصویروں کی صورت متغیر کر رہی تھیں۔

ان کے خاندان میں لڑکی کی رخصتی سے پہلے  
اسے دلہن بنانے کا رواج نہیں تھا سو اس کا نکاح بھی  
بغیر کسی تیاری اور میک اپ کے ہی ہوا۔ سادہ سے  
کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سر سے پاؤں تک چادر  
اوڑھے اسری میکا کی انداز میں تصویریں بنوا رہی  
تھی۔

”یار! تم نے تو یہ میدان مار ہی لیا۔ مجھے یقین نہیں  
آ رہا ہے۔“ نکاح کے بعد مہمانوں کی خاطر مدارات کا  
سلسلہ جاری تھا۔ جب فخر رشک بھرے انداز میں بولا  
۔ زیاد مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتح مندی کا عنصر  
نمایاں تھا۔

”میں کبھی نہیں ہارا اب تو تمہیں بھی یقین آ جانا  
چاہیے۔ ویسے راز کی بات بتاؤں، میرے دل کو بھی  
یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ میری ہم سفر بن گئی ہے۔ اس  
کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو گئے ہیں۔ میرے  
لیے یہ خواب ہی بڑا دلکش ہے۔“ اس کی آنکھوں سے  
سرمستی کی کیفیت عیاں تھی۔

”اوہ یارا! میرے ساتھ ہی کہیں رومینٹک  
ڈانسلگ بولنا نہ شروع کر دینا۔“ فخر نے اسے چھیڑا تو  
وہ اسے گھورنے لگا۔

”ویسے تمہارے لیے ایک ڈاکٹر کی یوں بھی اشد  
ضرورت تھی۔ آٹے دن ٹوٹے پھوٹے جو رہتے ہو۔  
تھوڑا فائدہ ہو جائے گا۔“

زیاد اسے مکار سید کرتے کرتے رہ گیا۔  
\* \* \*

اسری کی تمام تصویریں اس کے سامنے بکھری  
ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو کئی کئی بار دیکھ چکا تھا  
مگر طبیعت سیر ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب تم جلدی سے خود ہی چلی آؤ  
وہ اتنا ملن تھا کہ فخر کے آنے کی اسے خبر ہی نہیں  
ہوئی۔ ایک مشہور پراسے گمانے کی اس نے بیدردی  
سے ٹانگ توڑی تو زیاد ہڑبڑا گیا۔

”تم کیوں بے وقت نازل ہو گئے ہو۔“ وہ برا سامنہ  
بناتے ہوئے بولا۔

”کافی دیر سے جناب کا استغراق ملاحظہ کر رہا  
ہوں۔ یار! ابھی سے تمہارا یہ حال ہے۔ آئندہ جانے  
کیا ہو گا؟“

”فخر! تم نے کسی سے محبت کی ہو تو تمہیں پتہ ہونا!  
اس محاذ کو سر کرنے میں سمجھ لو کہ میں نے بہت پار پڑیلے  
ہیں۔ میں پہلی نگاہ کی محبت پہ ذرا بھی یقین نہیں رکھتا  
تھا مگر اسری کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین کرنا پڑا کہ محبت  
یوں بھی ہو جاتی ہے۔ اب میرے خواب کی حسین  
تعبیر مجھے ملنے والی ہے تو دل چاہتا ہے سب کو اس خوشی  
میں شریک کر لوں۔“ وہ جذباتی ہو گیا تو فخر نے اس کی  
خوشیوں کے دائمی رہنے کی دعا کی۔

علینہ بھابھی فخر کو آواز دے رہی تھیں وہ تصویریں  
وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

زیاد نے تمام تصویریں سمیٹ کر دراز میں ڈال  
دیں اور آنکھوں پہ بازو رکھ کر دراز ہو گیا۔ کمرے میں  
رکھا سپدھی آواز میں چل رہا تھا۔

چوری چوری آئے کوئی  
دل میں سمائے کوئی  
کبھی روٹھ جائے کبھی مان جائے  
سمٹے ہوئے آئینل کو کیسے اٹھائے کوئی

”زیاد نے ہاتھ برہا کر ایوم بلند کر دیا۔  
دیکھوں میں تو شرماے  
نظریں چرائے کوئی

154



کون تھیں؟

”نہیں۔“ اسری دم بخود ایک ایک لفظ میں کھوئی ہوئی تھی۔

”وہ دو لڑکیاں تم اور تمہاری بہن رابعہ تھیں۔ رابعہ پہ تو بس نہیں چلا مگر ابو جان نے تمہیں اپنا ٹارگٹ بنالیا۔ اسری! اس تعلیم یافتہ دور میں تمہاری قسمت کا فیصلہ بھیڑ بکریوں کی طرح کیا گیا۔ مردوں کی اس جنگ میں ہم عورتوں کو لوٹ کا مال کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اسری! تمہاری شخصیت کو ساری زندگی کو مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تمہیں پتہ ہے رابعہ کی شادی کے روز جب ہاشم پچا کو ہارٹ اٹیک ہوا تو اس کا سبب کون تھا؟ میرے والد محترم۔ اسری! وہ پچا کو موت کے دہانے پہ پھینک آئے۔ ان کا سنگ دلانہ رویہ ہاشم پچا کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اور تم پھر بھی خاموش ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو جانے کیا کچھ کر دالتی۔ بابر بھائی نے غلطی کی ہے سزا بھی انہیں ملنی چاہیے۔ ستم ظریفی تو دیکھو، تمہیں ایک نرم و نازک لڑکی کو سفید حویلی والے وحشیوں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ ہم سے اچھے تو وہی ہیں جنہیں اپنے معمولی سے ملازم کا اتنا خیال ہے۔ تم تو اس کی کمین سے بھی گئی گزری ہو بظاہر تو تم ملک انوار کے بیٹے کی بیوی بن کر جا رہی ہو مگر عملاً تمہیں اکبر کی چاکری خدمت گزاری اور تیمارداری کرنی پڑے گی کیا خبر جلد یا بدیر وہ جب تندرست ہو جائے تو اس کی بیوی کا کردار بھی ادا کرنا پڑے۔“

”پلیز زرین! مزید ایک لفظ مت کہنا۔ میں جان تو دے سکتی ہوں مگر مگر۔“ اس سے آگے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ حلق میں غم و غصے کی زیادتی نے جیسے پھند الگایا تھا۔

”تم جان مت دو یہاں سے نکلنے کی فکر کرو پھر تم میری سب کچھ کر سکو گی۔“ زرین نے اس کا ہاتھ تھپکاتھپکا کر کہا۔

”کل رات تک سب انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔“ زرین نے بڑی مشکل سے کہا۔

تمہاری تعلیمی اسناد اور دیگر چیزیں منگوائی ہیں ان کی سزا سنائی جا رہی ہے۔

تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میں جا رہی ہوں۔ اب سو جاؤ۔“ زرین اس کے ماتھے پہ پیار کر کے چلی گئی۔

\*\*\*

حرف تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے باب ایک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اس کی اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے اک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ گل کو معلوم ہے کیا دست صبا چاہتا ہے ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے اور صحرا تیرا نقش کف پا چاہتا ہے فارم ہاؤس بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے بھینکتی رات نگینہ عرف نگ کی سریلی ری سوز آواز کے ساتھ بڑی ریلی اور اکیلی سی لگ رہی تھی۔ زیادہ اور اس کے دوست رشتہ دار مہمان حضرات اور دوسرے تمام مردوں کے لئے یہاں فارم ہاؤس میں اپنے انداز میں خوشی منانے کے لیے ملک انوار نے بڑے زبردست انتظامات کیے تھے۔ وسیع قطعہ زمین پہ فرشی دریاں بچھا کر ان پہ گاؤں تکیے رکھے گئے تھے۔ سامنے قدرے بلند جگہ پہ اسٹیج بنا ہوا تھا جہاں اس وقت نگلی سازندوں کے ساتھ انی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ آئی نیلم اور پیکھراج تھک ہار کر بیٹھ گئی تھیں۔

زیادہ فخر اور ارمان کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ من پہلے بے قابو ہو کر نیلم اور پیکھراج کے ساتھ زبانی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

”تم کیا زاہد خشک بن کر بیٹھے ہوئے ہو۔ شادی سے پہلے ایسے تجربات ضرور کرنے چاہئیں بیوی رعب میں رہتی ہے۔“ زیادہ کے چچا زاد کاشف نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا جو اس نے نرمی سے چھڑا لیا۔

”پلیز یار! مجھے معاف ہی رکھو۔“

زیادہ بد مزاسا ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کے پیچھے سگریٹ سلا کر وہ لمبے لمبے کش لیتا اسری کے ہی

ارے میں سوچ رہا تھا۔ اسری جو اس کی زندگی میں اندلہ طور پر شامل ہو گئی تھی۔

زیادہ نے جب اسے پہلی بار ہاسپٹل میں دیکھا تھا تو اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ شہباز گیلانی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے خاندان میں لڑکیاں نہیں تھیں یا پھر اسری اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔

زیادہ کو اس کا انداز سیجائی اور پر اعتماد رویہ بہت اچھا لگا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شامل ہو جائے۔ وہ جاگتی آنکھوں سے چلتے پھرتے اس کے خواب دیکھتا۔ بن کے بن مانگے اس کی آرزو کی تکمیل ہو گئی تھی۔

شہباز گیلانی کے اکلوتے بیٹے بابر نے اس کے چہیتے ملازم اکرم کو شدید زخمی کر دیا تھا پھر جرگہ بیٹھا جس میں فیصلہ ہوا یا تو بابر کو ان کے حوالے کیا جائے یا پھر شہباز کی بیٹی کو سفید حویلی والوں کی ہونٹیاں جائے۔ شہباز کے لیے دونوں فیصلے ناقابل قبول تھے مگر جرگے کے فیصلے سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

اسی دوران دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زیادہ نے اسری کے بارے میں تمام معلومات حاصل کروا لیں تو ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اس کا سارا خاندان دل سے اس دشمنی کا خاتمہ چاہتا تھا جو سالہا سال سے چلی آرہی تھی اس لیے انہوں نے حویلی والوں کی بیٹی سے نکاح کی شرط رکھی تھی۔ کیونکہ اپنی بیٹی ملکوں کو بیاہنے کے بعد لازمی طور پہ انہیں اپنے معاہدے کی پاس داری کرنی پڑتی شاید اس طرح سچ و سچ وہ نرم پڑ جاتے کیونکہ ان کی بیٹی ملکوں کی بہو ادنیٰ۔ وہ ملکوں کا نہ سہی اپنی بیٹی کا تو ضرور خیال کرتے۔ اس طرح دونوں خاندانوں کے مابین رسہ کشی کا خاتمہ ہو جاتا ایک امن و محبت کی فضا بن جاتی۔ اس طرح ان کے گاؤں کا قسمت ہی بدل جاتی کیونکہ وہاں کے باسی بھی قدرتی طور پہ دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک حصہ ملکوں کی حمایت پہ کمر بستہ تھا تو دوسرا گیلانیوں کی سائیڈ لیتا۔

شہباز گیلانی کے لئے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ لاڈلی زرین دشمن کے گھر جائے اس طرح تو ان کی طاقت ہی صفر ہو جاتی۔ بابر روپوش تھا۔ ادھر جرگے والوں کا اصرار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

شہباز گیلانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہیں سمجھنے کی بات نظر نہیں آتی تھی۔ ہاشم کی بیٹیاں کس مرض کی دوا تھیں۔

”کون سا ہاشم میرے برابر کا ہے۔ کون سا رابعہ اور اسری ہمارا خون ہیں۔ وہ صرف ہاشم کا خون ہیں۔ اس ہاشم کا جس سے میں بے حد نفرت کر رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے شہباز غالباً یہ بات فراموش کر گئے تھے کہ رابعہ اور اسری ان کی پھوپھی زاد ذری کی اولاد بھی ہیں۔

تین سال پہلے شہباز نے ہاشم کو ڈھونڈ نکالا تھا انہوں آنا جانا شروع ہو گیا بلکہ جانے کی بات غلط تھی کیونکہ شہباز ہی ہاشم کے پاس خود آتے تھے وہ کبھی کبھار ہی گاؤں جاتے۔ شہباز اب یکسر بدلے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ہاشم کا اعتماد حاصل کر لیا۔ رابعہ کی بات طے کر دینے انہوں نے بہت شور مچایا۔ ہاشم کو طرح طرح کے لانچ دیے۔

رابعہ کے سلسلے میں ان کو بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی حالانکہ اس سلسلے میں انہوں نے ہر طریقہ آزما کر دیکھ لیا تھا مگر شاید کاتب تقدیر کو ان کے مذموم ارادے اچھے نہیں لگے وہ چاہتے تھے کہ جرگے والوں کے سامنے سفید حویلی والوں کی بہو کے طور پہ رابعہ اور اسری کا نام پیش کریں۔ اس بارے میں انہوں نے ملک انوار کو ہموار کرنا شروع کر دیا۔

شہباز گیلانی نے ملک انوار کو لکھ کر دیا کہ وہ ہاشم گیلانی کی بیٹی ڈاکٹر اسری کا رشتہ بڑی خوشی سے انہیں دے رہے ہیں۔ اس روز سفید حویلی میں جشن کا سماں تھا کیونکہ شہباز گیلانی نے بیٹی دے کر شکست قبول کر لی تھی۔ زیادہ کو بھی پتا چل چکا تھا کہ جس لڑکی کو جرگے والوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ ڈاکٹر اسری ہے اس نے ملک انوار کو کھل کر بتا دیا کہ وہ جس لڑکی کے لیے چھ ماہ سے خوار ہو رہا ہے وہ یہی لڑکی ہے۔

”ہم اسے اپنی بیٹی اپنی عزت بنا کر لائیں گے کیونکہ وہ ہمارے زیادتی محبت ہے۔ اور محبت قدموں میں نہیں دل میں بسا کر رکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ ہم سچ سچ صدق دل سے اپنی دشمنی کا ہمیں یہ خاتمہ کر رہے ہیں۔ جو چیز زیادہ کو پیاری ہے وہ ہمیں بھی پسند ہے۔ ہم پوری دھوم دھام سے اسری کو بیاہ کر لائیں گے“

اماں جان نے اعلان کیا تو زیادہ خوشی سے بے قابو ہو کر اسی وقت ان کے گلے لگ گیا۔

زیادہ کارواں رواں رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔ اسری کا تصور ہی اس کے لیے نشاط انگیز تھا۔ اسے بڑی آرزو تھی کہ وہ اسری کو مایوں کی دوا لہن کے روپ میں دیکھتا۔ فخر نے اس کی دل کے آرزو پوری کر دی تھی۔ اور مایوں کی مودی کسی طرح حاصل کر کے اس تک پہنچا دیں۔

”زرد مقیش لگے سوٹ میں ملبوس موتیا کے گجرے باندھے وہ اسے اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس کا جھکی جھکی آنکھوں والا کلو زاپ زیادہ بار بار فلم ریو اینڈ کر کے دیکھا۔

کچھ دیر بعد کاشف اسے ڈھونڈتا ہوا کھلے احاطے میں آگیا جہاں زیادہ جنگل سے بازو نکائے کسی غیر مرئی چیز نظر نہیں جمائے ہوئے تھا۔ کاشف کی آمد سے اس کے تحسین تصورات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔

”تم آج کے مہمان خصوصی ہو اور یہاں بیٹھے ہو۔ سب تمہاری گمشدگی کے بارے میں الٹی سیدھی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ آؤ اندر دیکھو تو محفل عروج ہے۔“

کاشف زبردستی اسے اندر لے آیا۔ واقعی اندر محفل عروج پہ تھی۔ نگی اسٹیج سے اتر کر شائقین کے درمیان ٹھکر رہی تھی ”ایک اشارے کی دیر ہے۔“

زہیل نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔ ”سناؤ اس کی سزا“

”میری محبت چاہت ہے کہ اسری کی امانت میرے ہاتھ میں رہے۔“

”خدا خواہ مخواہ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔“

وہ فارم ہاؤس سے نکل کر باہر ایک قطار میں کھڑی تھی۔

گاڑیوں کے پاس آیا جس میں اس کی بلیک اکارا ۱۱ تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے کندھے پہ کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے ہاتھ بے اختیار اسل کے سینے سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی وہ فخر تھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ واپس چولی جاؤں“

یہاں تو ایک طوفان بد تمیزی برپا ہے۔ فخر کے لیے بد نظمی تھی۔

”رات بھی تو بہت ہو گئی ہے دو بجنے والے ہیں۔“

زیادہ نے کلائی پہ بندھی رسٹ واپس وقت دیکھا۔

”تم بھی آرام سے جا کر سو جانا تاکہ صبح جلدی ہو جائے۔“ فخر نے اسے چھیڑا تو وہ مسکرانے لگا۔

”صرف آج کی رات ہی تو بیچ میں حائل ہے۔“

زیر لب بولا اور گاڑی ریورس کر کے موڑنے لگا۔

☆ ☆ ☆

سفید چولی میں رت جگمگایا جا رہا تھا۔ شب کے پرسکون سناٹے کو ڈھول اور شہنائی کی آوازیں ایک تسلسل سے مجروح کر رہی تھیں۔ ادھر فارم ہاؤس میں آتش بازی جاری تھی۔ سب اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

اسری کو یہ آوازیں اپنا تسخراڑاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس کی نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ وقت آٹھ رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ اچانک دروازے پہ دستک ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

آنے والی تھی۔

”آپ تیار ہو جائیں بی بی جی۔“ وہ ایک جملہ بول کر غراب سے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

ابھی آدھا گھنٹہ بیشتر اسری کا کمر لڑکیوں سے بھرا نہیں تھا یوں لگ رہا تھا وہ مارے باندھے ہنس بول رہی تھی۔ مہمان بھی کوئی خاص نہیں تھے۔ بس اپنے رشتہ دار اور کچھ جاننے والے مدعو تھے۔ لڑکی والوں کی آج

کوئی رسم یا تقریب نہیں تھی اس لیے سب بے فکر تھے۔

البتہ مردانے میں خاصی چل پھل تھی۔ باراتیوں کے لیے دعوت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔

شہباز گیلانی ملازمین کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر سونے چلے گئے۔ اسری کا کمر ابھی خالی تھا۔ بڑی عمر کی خواتین پہلے ہی آرام کے لیے جا چکی تھیں۔ باقی لڑکیوں کے لیے شمی نے کشمیری قہوہ تیار کیا۔ جسے پینے کے بعد سب کو ہی نیند آنے لگی۔

اسری نے ہاتھ روم میں جا کر دوسرے کپڑے پہنے۔ موتیا کے گجرے بالوں اور کلائیوں سے نوچ کر وہیں پھینکے۔ ہاتھوں اور پاؤں پہ لگی مہندی کا البتہ فی الحال کوئی علاج نہیں تھا۔ بڑی سی چادر اوڑھے وہ بالکل تیار تھی۔ ہر آہٹ پہ دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔ اسری کو تو دھیروں پسینے آنے لگے۔ زرین بلی کی چال چلتی اسری کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا بڑا خوبصورت سا شو لڈر بیگ دیا ہوا تھا۔

”اسری! اس بیگ میں کچھ رقم، تمہاری تعلیمی اسناد اور دیگر ضروری چیزیں ہیں اور یہ میری طرف سے ہے جب عزت، موت اور زندگی میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑا تو یہ تمہاری مدد کرے گا۔“ اس نے وزن میں ہلکا اور چھوٹا سیاہ ریوالتور اسری کی طرف بڑھایا۔

”خضر تمہیں سیدھا لاہور پہنچائے گا اور یہ رہا ایڈووکیٹ عالم درانی کا دفیننگ کارڈ اور ایڈریس۔ انسانی حقوق کا یہ نامی گرامی وکیل ہے اسے میں نے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد میں رابعہ کو بھی سب کچھ بتا دوں گی۔ اب جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ تاخیر سے ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔“

”زرین! تم جس طرح میری مدد کر رہی ہو میں ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھولوں گی اگر زندگی رہی تو تمہارا احسان اتارنے کی کوشش کروں گی۔“

”اس میں احسان کی کیا بات ہے۔“ زرین نے کچھ

اور روئے زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمائے پہلے شمی باہر نکلی اس کے بعد زرین کے ساتھ اسری نکلی۔

شمی حویلی کی عقیبی بسمت میں چلتی جا رہی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں نوکروں کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بنوائے گئے تھے بعد میں حویلی کی تزئین و آرائش کے سلسلے میں جب نئے کمرے تعمیر کیے گئے تو اس حصے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ نوکرنے حصے میں منتقل ہو گئے یہ حصہ ویران ہی رہا۔ اس طرف آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ عقیبی بسمت کی دیوار کی لمبائی پانچ فٹ کے برابر تھی اور یہاں کوئی پہرا بھی نہیں تھا۔ اسری، شمی کے ساتھ اسی طرف سے باہر نکلی۔ دیوار کے ساتھ شمی نے پہلے ہی ایک پرانا سا اسٹول لاکر رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے اسری کو دیوار پہ چڑھنے میں مدد دی۔ شمی نے پہلے دیوار سے چھلانگ لگائی۔ وہ دیہاتی فضا میں پلی بڑھی تھی بڑے آرام سے پانچ فٹ اونچی دیوار سے باہر کی طرف کود گئی۔ اسری البتہ ڈر رہی تھی۔ شمی کے حوصلہ دلائے اس نے کودنے کے بجائے لٹک کر اترنے کو ترجیح دی۔ اس کوشش میں اس کی کہنیاں چھل گئیں مگر اس وقت یہ تکلیف بے معنی تھی۔

زرین نے ٹیبل پہلے کی طرح پرانی جگہ پہ رکھ دی۔ شمی اسری کو خضر کی گاڑی کے پاس چھوڑ کر دوبار دیوار کے ذریعے حویلی میں آگئی۔

خضر نے گاڑی حویلی کے داخلی گیٹ سے کافی دور مخالف سمت میں کھڑی کر رکھی تھی۔ اسری جو نہی اندر بیٹھی اس نے فوراً اشارت کر دی۔

وہ سڑک سے ہٹ کر کچے راستے پہ جا رہا تھا۔ اسری نے اس کا چہرہ دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچا راستہ بہت خراب اور ناہموار تھا۔ مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ دو روز پہلے ہونے والی بارش کی وجہ سے ٹائر بار بار پھسل رہے تھے۔ خضر کو گاڑی ڈرائیو کرنے میں خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔

خضر نے کچھ دیر بعد اسے پہلی بار مخاطب کیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس نے خاصی اپنائیت سے سوال کیا جو اسری کو بہت برا لگا۔

”تمہیں کیا میرا جو نام بھی ہو اپنے کام سے کام رکھو۔“ خضر کے لبوں پہ زہریلی سی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

”ایک نوکرانی ہو کر اتنا خزا۔ ذرا یہاں سے نکلو تو اس کا سارا خزانہ کے راستے نکال باہر نہ کیا تو اپنا نام بھی خضر نہیں۔“ اس نے دل میں سوچا۔ خضر شمی کا بہنوئی تھا۔ شادی کے بعد وہ بیوی کو شہر لے گیا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ فراڈ دھوکہ بازیوں کے ذریعے دوسروں سے رقم بٹورنا اس کا کام تھا۔ جس کام سے بھی اسے اضافی آمدنی کی امید ہوتی۔ وہ جائز ناجائز دیکھے بغیر اسے کر گزرتا۔ اپنے جیسے لوگوں میں ہی اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ آج کل بیوی کے ساتھ گاؤں آیا ہوا تھا۔ زرین بھی اسے پہچانتی تھی کیونکہ شہباز کے پاس اس کا آنا جانا لگتا تھا۔ وہ اس کی شہرت سے بھی واقف تھی۔ شمی کے توسط سے راز داری کا وعدہ لے کر اس نے خضر سے اپنے کام کا کہا۔ پیسے کے بارے میں سنتے ہی خضر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک معمولی سے کام کے اتنے زیادہ پیسے۔ اسے ایک لڑکی کو گاؤں سے باہر پہنچانا تھا اور بس۔ زرین نے لڑکی کے بارے میں اسے ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ تجسس کے باوجود وہ پوچھنے کی جرات نہ کر سکا ہاں زرین نے اتنا ضرور کہا کہ یہ ہمارے ملازم کی بیٹی ہے۔ اب اس ایک جملے سے پوری کہانی بنانا خضر کا کام تھا۔ شمی کو لاکھ کریدنے کے باوجود اس نے ایک لفظ پھوٹ کر نہ دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ خضر کی نیت میں کچھ کچھ فتور آگیا تھا۔

”بڑا بڑا ہے اگر شہر پہنچانے سے پہلے میں بھی اس بستی میں نڈی میں ہاتھ دھو لوں شمی کو کیا پتہ چلے گا اور کوئی میرا رہ کر یا بگاڑ لے گا۔“ اس کے شیطانی ذہن میں کشمکش رونے لگی۔

”بڑا بڑا ہے اس کا بلوغ اس بستی طرح انکا کہہ رہا ہے۔“ اس نے سوچا۔

اسے سامنے موجود گڑھا دیکھنے کے باوجود دکھائی نہ دیا۔ گاڑی کا اگلا ٹائر اس گڑھے میں جا پھنسا تو ایک دم توازن بگڑ گیا گاڑی ایک سائیڈ سے ترچھی ہو گئی۔ خضر زیر لب گالیاں بکتا نیچے اترا اور گڑھے کا معائنہ کرنے لگا۔ کچے کے ساتھ ساتھ جاتی کی سڑک پہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس قریب آتی نظر آرہی تھیں۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہو گیا اس نے دعا کی کہ کاش گاڑی میں موجود افراد کی نظر اس پہ نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے اس طرح اس کا بھانڈا پھوٹ جائے کیونکہ زرین نے بار بار اس سے کہا تھا وہ کسی قسم کا رسک نہ لے۔ ساٹھ ہزار کے لیے وہ ویسے بھی رسک لینے پہ تیار نہیں تھا اس لیے تو وہ کچے راستے پہ ڈرائیونگ کرتا آیا تھا۔

”ارے یہ کون بیوقوف کا بچہ ہے۔ اچھی بھلی سڑک ہوتے ہوئے اس راستے پہ گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے۔ مگر یہ کیا یہ تو رکی ہوئی ہے۔ زیادہ لڈرا گاڑی روکنا میں نیچے اتر کر دیکھتا ہوں۔ شاید ہماری مدد کی ضرورت ہو۔“ نخر اتر کر سنبھل سنبھل کر پاؤں جاتا کریم کلر کی سوزوکی ایف ایکس کے پاس پہنچا جہاں کوئی ساکت کھڑا تھا۔

”کون ہو تم اور کیا مسئلہ ہے؟“ وہ کڑک کر بولا۔ خضر ملک فخر کو فوراً پہچان گیا۔

”ملک صاحب آپ!“

”خضر! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ فخر کی حیرت فطری تھی۔ اتنے میں زیادہ بھی ہیڈ لائٹس جلتی چمکڑ کر فخر کے پیچھے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی جو اس نے روشن کر لی تھی۔ فخر کی طرح وہ بھی خضر کو دیکھ کر حیران ہوا۔

”کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟“

”گاڑی کا اگلا ٹائر گڑھے میں پھنس گیا ہے ملک صاحب!“ وہ حد درجہ انکساری سے بولا۔

”تمہیں پتہ ہے جس راستے پہ تم ڈرائیونگ کر رہے ہو۔ کتنا خراب ہے۔“

”بس جلدی میں غلطی ہو گئی مائی باپ اصل میں

اچانک ہی میری ساس کی طبیعت خراب ہو گئی جلدی

جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا میں روڈ تک جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔“ خضر نے لولا انکڑا سا جواز پیش کیا۔

”اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟“

”ڈپنری لے کر جا رہا ہوں؟“

”رات کے ڈھائی بجے؟“ فخر نے کھائی پہ بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

”وہ جی ڈپنری سٹیشن سے میری اچھی دعا سلام ہے

اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔“ خضر نے دل میں

ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا

تھا۔

”اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم

گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ل جل کر یہ کام ہو گا۔“

زیادہ نے گم حکم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرنایا

نہ کرنا کہ مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا

بس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیادہ ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا

دو نہی اسری باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ

نے ایک مانوس سی خوشبو کو فوراً محسوس کیا یہ پرفیوم

اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ

سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ

ابن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنے حسن کو فزوں

تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا

کہ تین روز پہلے دانیہ بھابھی، تانیہ بھابھی، علیہہ اور

ایک لڑکیوں نے اسے دھوکے سے گھیر کر اسے بھی ابن

گانے کی کوشش کی تھی۔ فخر نے شرط لگائی تھی مگر

میں وقت پہ اسے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے

گھیرے سے نکل آیا۔

”خضر کی ساس خاصی شوقین مزاج لگتی ہیں۔“

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا۔ اور بالکل

بے دھیانی میں روشن دائرہ اسری پہ رکا تھا۔ مارے

گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس

ہاتھ سے اس نے چادر کاٹھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا۔

جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا میں روڈ تک

جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔“ خضر نے لولا

انکڑا سا جواز پیش کیا۔

”اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟“

”ڈپنری لے کر جا رہا ہوں؟“

”رات کے ڈھائی بجے؟“ فخر نے کھائی پہ بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

”وہ جی ڈپنری سٹیشن سے میری اچھی دعا سلام ہے

اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔“ خضر نے دل میں

ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا

تھا۔

”اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم

گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ل جل کر یہ کام ہو گا۔“

زیادہ نے گم حکم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرنایا

نہ کرنا کہ مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا

بس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیادہ ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا

دو نہی اسری باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ

نے ایک مانوس سی خوشبو کو فوراً محسوس کیا یہ پرفیوم

اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ

سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ

ابن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنے حسن کو فزوں

تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا

کہ تین روز پہلے دانیہ بھابھی، تانیہ بھابھی، علیہہ اور

ایک لڑکیوں نے اسے دھوکے سے گھیر کر اسے بھی ابن

گانے کی کوشش کی تھی۔ فخر نے شرط لگائی تھی مگر

میں وقت پہ اسے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے

گھیرے سے نکل آیا۔

”خضر کی ساس خاصی شوقین مزاج لگتی ہیں۔“

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا۔ اور بالکل

بے دھیانی میں روشن دائرہ اسری پہ رکا تھا۔ مارے

گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس

ہاتھ سے اس نے چادر کاٹھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا۔

جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا میں روڈ تک

جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔“ خضر نے لولا

انکڑا سا جواز پیش کیا۔

”اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟“

”ڈپنری لے کر جا رہا ہوں؟“

”رات کے ڈھائی بجے؟“ فخر نے کھائی پہ بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

”وہ جی ڈپنری سٹیشن سے میری اچھی دعا سلام ہے

اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔“ خضر نے دل میں

ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا

تھا۔

”اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم

گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ل جل کر یہ کام ہو گا۔“

زیادہ نے گم حکم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرنایا

نہ کرنا کہ مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا

بس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیادہ ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا

دو نہی اسری باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ

نے ایک مانوس سی خوشبو کو فوراً محسوس کیا یہ پرفیوم

اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ

سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ

ابن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنے حسن کو فزوں

تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا

کہ تین روز پہلے دانیہ بھابھی، تانیہ بھابھی، علیہہ اور

ایک لڑکیوں نے اسے دھوکے سے گھیر کر اسے بھی ابن

گانے کی کوشش کی تھی۔ فخر نے شرط لگائی تھی مگر

میں وقت پہ اسے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے

گھیرے سے نکل آیا۔

”خضر کی ساس خاصی شوقین مزاج لگتی ہیں۔“

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا۔ اور بالکل

بے دھیانی میں روشن دائرہ اسری پہ رکا تھا۔ مارے

گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس

ہاتھ سے اس نے چادر کاٹھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا۔

جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا میں روڈ تک

جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔“ خضر نے لولا

انکڑا سا جواز پیش کیا۔

”اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟“

”ڈپنری لے کر جا رہا ہوں؟“

”رات کے ڈھائی بجے؟“ فخر نے کھائی پہ بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

”وہ جی ڈپنری سٹیشن سے میری اچھی دعا سلام ہے

اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔“ خضر نے دل میں

ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا

تھا۔

”اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم

گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ل جل کر یہ کام ہو گا۔“

زیادہ نے گم حکم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرنایا

نہ کرنا کہ مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا

بس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیادہ ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا

دو نہی اسری باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ

نے ایک مانوس سی خوشبو کو فوراً محسوس کیا یہ پرفیوم

اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ

سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ

ابن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنے حسن کو فزوں

تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا

کہ تین روز پہلے دانیہ بھابھی، تانیہ بھابھی، علیہہ اور

ایک لڑکیوں نے اسے دھوکے سے گھیر کر اسے بھی ابن

گانے کی کوشش کی تھی۔ فخر نے شرط لگائی تھی مگر

میں وقت پہ اسے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے

گھیرے سے نکل آیا۔

”خضر کی ساس خاصی شوقین مزاج لگتی ہیں۔“

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا۔ اور بالکل

بے دھیانی میں روشن دائرہ اسری پہ رکا تھا۔ مارے

گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس

ہاتھ سے اس نے چادر کاٹھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا۔

جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا میں روڈ تک

جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔“ خضر نے لولا

انکڑا سا جواز پیش کیا۔

”اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟“

”ڈپنری لے کر جا رہا ہوں؟“

”رات کے ڈھائی بجے؟“ فخر نے کھائی پہ بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

”وہ جی ڈپنری سٹیشن سے میری اچھی دعا سلام ہے

اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔“ خضر نے دل میں

ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا

تھا۔

”اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم

گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ل جل کر یہ کام ہو گا۔“

زیادہ نے گم حکم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرنایا

نہ کرنا کہ مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا

بس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیادہ ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا

دو نہی اسری باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ

نے ایک مانوس سی خوشبو کو فوراً محسوس کیا یہ پرفیوم

اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ

سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ

ابن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنے حسن کو فزوں

تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا

کہ تین روز پہلے دانیہ بھابھی، تانیہ بھابھی، علیہہ اور

ایک لڑکیوں نے اسے دھوکے سے گھیر کر اسے بھی ابن

گانے کی کوشش کی تھی۔ فخر نے شرط لگائی تھی مگر

میں وقت پہ اسے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے

گھیرے سے نکل آیا۔

”خضر کی ساس خاصی شوقین مزاج لگتی ہیں۔“

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا۔ اور بالکل

بے دھیانی میں روشن دائرہ اسری پہ رکا تھا۔ مارے

گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس

ہاتھ سے اس نے چادر کاٹھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا۔

جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا میں روڈ تک

جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔“ خضر نے لولا

انکڑا سا جواز پیش کیا۔

”اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟“

”ڈپنری لے کر جا رہا ہوں؟“

”رات کے ڈھائی بجے؟“ فخر نے کھائی پہ بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

”وہ جی ڈپنری سٹیشن سے میری اچھی دعا سلام ہے

اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔“ خضر نے دل میں

ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا

تھا۔

”اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم

گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ل جل کر یہ کام ہو گا۔“

زیادہ نے گم حکم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرنایا

نہ کرنا کہ مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا

بس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

جھٹکا سا لگا۔ یہ تو ڈاکٹر اسری تھی۔ زیادہ کی جان جہاں جس کے حصول اور محبت کے لیے وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔

”کون ہے فخر؟ کیا اپنے ہی گاؤں کی لڑکی ہے جویت بن گئے ہو۔“ زیادہ بھی اس کے پاس آگیا فخر بیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا اس کا جی نہیں چاہا تھا کہ زیادہ کا دھواں دھوں ہو ناچار دیکھے۔

”اوہ مائی گاڈ!“ زیادہ کے ہاتھ سے ٹارچ گر پڑی۔ اسری نے ایک بار بھی ان دونوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ فخر نے اس موقع پہ اپنے حواس برقرار رکھے اور خضر کے پاس آیا۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ صبح گاڑی لے جانا۔ اس واقعے کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تمہیں واقعی نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے؟

”ملک صاحب! آپ یقین کریں مجھے نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے۔“

خضر سچ بول رہا تھا۔ جان بچی سولا کھوں پائے کے مصداق وہ ایک طرف تیز تیز چلتا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساٹھ ہزار اس کی جیب میں تھے۔ زرین نے کہا تھا اگر وہ پکڑا جائے تو یہی کہے کہ مجھے نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے۔ اس نے من و عنین یہی جملہ دہرایا تھا۔ اتنی آسانی سے جان بچ گئی تھی ورنہ ایک لڑکی کے ساتھ بچ نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

\*\*\*

”زیادہ! حویلی چلو شہباز انکل کے پاس۔“ فخر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا جو اس نے فوراً جھٹک دیا۔ ”یہ میری منکوحہ ہے۔ آدھی رات کو ایک غیر آدمی کے ساتھ پائی گئی تم کہہ رہے ہو حویلی چلو میں اسے مار ڈالوں گا۔“ اسری کھڑے کھڑے دھڑام سے نیچے گری۔

”ترن زیادہ! ہوش رہندی نہ سے کام لےو۔“ فخر نے اسے نہیں ہوش سے کئے جاتے ہیں۔ ابھی کسی کو پتہ نہیں ہے کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر شہباز کے ساتھ کل پاس چلیں وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ یہ سب کیا ہے۔

”ترن زیادہ! ہوش رہندی نہ سے کام لےو۔“

بدگمانی اچھی نہیں ہوتی اور تم تو جو محبت کے اتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے رہے ہو۔ کس آسانی سے کہہ دیا میں اسے مار ڈالوں گا۔ کیا بھول گئے یہ وہی ہے جس کے ملن کی آس میں تمہارا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔“

”مگر فخر! وہ آدھی رات کو اس خضر کے ساتھ کون سے وکیل کے پاس جا رہی تھی۔“

”اگر مگر کچھ نہیں وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ حویلی چلو سب پتہ چل جائے گا۔“

فخر گھوم کر پیچھلی سمت میں آیا اسری زمین پہ بے ہوش پڑی تھی جبکہ ان کی اکاؤنٹس پر تھوڑی دوری کھڑی تھی۔

”زیادہ! انہیں اٹھا کر گاڑی تک لے چلو یہ بے ہوش ہیں۔“

اسری فخر سے چھوٹی تھی مگر وہ بڑے احترام سے بول رہا تھا۔ وہ سلگ سا گیا۔ گرتے وقت بھی شولڈر بیگ اسری کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا جواب زمین پہ ایک طرف پڑا تھا۔ زیادہ بنجوں کے بل اسری کے پاس بیٹھا جلتے کڑھتے ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈالا۔ کچھ دیر پہلے تک جب وہ فام ہاؤس میں تھا تو ملن کی اولین ساعتوں کا تصور کر کے ہی اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔ اب اسے چھو کر زیادہ کے دل میں کوئی پھول نہیں کھلا اس نے اسری کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی تک پہنچایا ہر احساس سے عاری ہو کر۔ فخر کے ہاتھ میں اسری کا بیگ تھا۔

حویلی پہنچنے تک ان دونوں کے درمیان کوئی اور بات نہیں ہوئی ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری رہی۔ ہر طرف سناٹا اونگھ رہا تھا۔

حویلی کی حالت سے لگ رہا تھا کہ انہیں اس حادثے کا پتہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی چلا ہے کیونکہ اسری کے کزن اس کی تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔

سلطانہ خاتون اپنے شوہر شہباز کے ساتھ کل ہونے والی تقریب کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ سونے سے پہلے حسب معمول انہوں نے ساری حویلی

کا چکر لگایا۔ زرین سے یہاں یہ غلطی ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ امی جان سوچکی ہیں مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اسری کے کمرے کی جتنی بھی ہوئی تھی۔ زرین سے یہ دوسری بڑی غلطی ہوئی کیونکہ اسری لائٹ جلا کر سونے کی عادی تھی۔ اب تو سلطانہ خاتون کو بھی اس کی اس عادت کی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول کر اسری کو دو تین بازو آواز دی مگر جواب نہ دار۔ لائٹ جلائی گئی تو ماجر ا کھلا۔

”شہباز انکل! اسری! ہماری گاڑی میں ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ انہیں ابتدائی طبی امداد کی ضرورت ہے غالباً۔“

فخر اور زیادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زندگی بھر شہباز کی کبھی یہ حالت نہیں ہوئی تھی جو اس وقت ہو رہی تھی۔ فخر نے مصحتاً یہ بات جان کر چھپائی تھی کہ اسری خضر کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس نے یہی کہا کہ اسری انہیں سفید حویلی جاتے ہوئے راستے میں ملی۔ فخر کو احساس تھا کہ اس کا یہ بیان بہت کمزور اور جھول دار ہے مگر شہباز کو اس پہ یقین کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

کتنی دیر وہ سر تھامے بیٹھے رہے۔ ان کی ساری زندگی کی کمائی بس فخر و ناز اور عزت ہی تو تھی جسے اسری نے کس پری طرح روندنے کی کوشش کی۔ کل اس کی رخصتی تھی۔ اس نے تو ان کے منہ پہ کالک ملنے اور شکست فاش دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

انہیں اس بات کا بھی اچھی طرح پتہ تھا اگر زیادہ شادی سے انکار کر دیا تو شرط کے مطابق انہیں زرین کو ملک انوار کی بہو بنانا ہی پڑے گا کیونکہ زیادہ کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ بڑی مشکل سے اپنے تیز و تند جذبات کے طوفانی ریلے کو چھپائے بیٹھا ہے۔

”اسری! بیٹی جھٹی ہے۔ پاگل ہے۔ اس کے میرے ساتھ کچھ اختلافات ہیں اس نے اپنے جذبات مجھ تک پہنچانے کے لیے برا غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔

”بہت خوب وہ شادی کے گھر سے رات گئے نکل کر جانے کہاں جا رہی تھی اور آپ کچھ اختلافات کا نام دے کر اپنی جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔“

زیادہ کے منہ میں جو کچھ آیا بولتا چلا گیا۔ اتنے میں اسری کے دوسرے چچا بھی آگئے۔ معاملہ بہت سنگین رخ اختیار کر رہا تھا۔ فخر نے کئی بار ہاتھ دبا کر زیادہ کو خاموش رہنے کو کنا مکر وہ تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے ذرا معقولیت کا مظاہرہ کرو۔“ فخر نے رسان سے سمجھایا وہ خفگی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”تم کہہ رہے ہو؟۔ یہ سب تم کہہ رہے ہو فخر! تمہیں پتہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں گھر سے فرار ہونے والی لڑکی کو کوئی بھی مرد دل بھلانے کا سامان تو بنا سکتا ہے مگر زندگی بھر کا ساتھی نہیں۔“

”یہ وقت بہت نازک ہے اگر ہم اس موقع پہ پیچھے ہٹ گئے تو ہر کوئی ہم پہ تنہو تھو کرے گا۔ لوگ کہیں گے بڑی شان سے شادی کرنے چلے تھے۔ مجھے یقین ہے۔ حویلی سے باہر ہم دونوں کے سوا کوئی بھی اس بات سے واقف نہیں ہے۔ سو پرہ پوشی ہی بہتر ہے بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”ہاں زیادہ بیٹا! فخر ٹھیک کہہ رہا ہے تم کل کا دن گزرنے کے بعد اسری کو بے شک گولی مار دینا مگر اس وقت میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تم نے اس نازک وقت میں ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہماری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ شہباز کی مغرور گردن اپنے دشمن کے بیٹے کے آگے جھک گئی اور وہ جو میری غیرت کا جنازہ نکالنے چلی تھی۔ اس کا حساب کون دے گا؟۔“

”زیادہ بیٹا! یقین کرو اسری ایسی دلی لڑکی نہیں ہے۔“

”پھر اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا ہے؟“ اب شہباز کے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا سچ بول کر ہی وہ اپنی انا کو سلامت رکھ سکتے تھے۔

”میں نے اسے شہر سے لا کر حویلی میں محصور کر رکھا تھا۔ اسری کے نکاح کی خبر اس کی بہن تک کو



نہیں ہے۔ میں نے اسے نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی صورت اس نے اندرونی بھڑاس کو باہر تو نکالنا ہی تھا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں ایک بار پھر تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں خدا را! میری عزت کا خیال رکھنا۔“

چشم فلک نے ایک عجیب ہی تماشہ دیکھا۔ زندگی بھر دوسروں سے رعونت زدہ لہجے میں بات کرنے والا انہیں حقیر سمجھنے والا انہی گردن والا شہباز گیلانی اپنا اونچا شملہ اتار کر زیادہ کے پاؤں میں رکھنے لگا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ کہیں زرین متبادل کے طور پر تاوان میں نہ چلی جائے۔ اولاد کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے انسان کو پستی میں گرا دیتی ہے۔

فخر نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی نے بھی زیادہ کو قائل کرنے کے لیے اپنی عزت کا واسطہ دیا۔

”انکل! میں اسری سے بات کرنا چاہتا ہوں اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہو تو۔“ شہباز گیلانی اٹھ کر فخر کے ساتھ ہو لیے۔ زیادہ ہیں بیٹھا جوتے سے قالین کریدتا رہا۔ اس کے چہرے یہ نا حال کبیدگی کے آثار تھے۔

اسری فق چہرے کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے موت کے سائے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے بالکل بھی رعایت کی خوش فہمی نہیں تھی۔

تینوں خواتین اسری کے پاس موجود تھیں۔ شہباز نے انہیں کمرے سے نکال دیا۔ اسری نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔

”فخر بیٹا! اندر آ جاؤ۔“ شہباز نے نشیمن نگاہوں سے اسری کی طرف دیکھتے ہوئے فخر کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔

”انکل معاف کیجئے گا۔ میں تنہائی میں ان سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بڑی شائستگی سے بولا تو فخر نے اسے کچھ دیر وہ اسری کے کمرے میں موجود کو دیکھا رہا اور پھر دوستانہ لہجے میں بولا۔

”میری طرف دیکھیں اسری! میں فخر ملک ہوں۔ زیادہ دوست اور پھوپھی زاد۔“

فخر نے اپنا تعارف کرایا۔

”پلیز آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ اگر مجھے یہ اعتبار ہے تو میرے چند سوالوں کا جواب دے دیں۔ آپ کہتے ہی نہیں ہے کہ آپ نے کیا کر ڈالا ہے۔“

فخر کے لہجے میں ہمدردی محسوس کرتے ہی اسری سسک سسک کر رونے لگی۔

”میں نے انتہائی پابوسی کے سرے پہ جا کر یہ فیعا کیا میری سوچ یہی تھی کہ شاید میری بقا اس میں ہے۔“

”آپ اتنی تعلیم یافتہ ہیں۔ کم از کم یہ احتمالہ قدم۔“ فخر خاموش ہو گیا۔

”مجھے پتہ تھا۔ سفید حویلی میں انسان بھی پائے جاتے ہیں شائستہ اور نرم دل انسان۔“ اسری کے اس ایک جملے میں جو راز نہیں تھا۔ فی الحال فخر کی عقل اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

”آپ خود کو اکیلا مت سمجھیں۔“ فخر نے اس کے سر پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

”کچھ گھنٹے پیشتر زرین نے بھی یہی۔“ خیال آنے پہ اسری نے فوراً باقی جملے کا گلا ہی کھونٹ دیا۔

”فخر واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ زیادہ وہاں نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ واپس گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا اور فخر کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”انکل! جو بات چھپی ہے اس کا چھپا رہنا ہی بہتر ہے ورنہ یہ دشمنی کے ایک نئے محاذ کو کھول سکتا ہے۔ اسری زیادہ کی امانت ہے ہم کل وقت مقررہ پہ آئیں گے۔ آپ اب کسی اور کے سامنے یہ قصہ مت چھیڑیے گا۔“ فخر نے سنجیدگی سے کہا اور باہر آ گیا۔

زیادہ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ فخر کو آتا دیکھ کر زوردار آواز میں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ اس کا تپا

سڑک گراس کر کے وہ جو نمی و رویہ راستے پہ آئے فخر نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔

”زیادہ! تم نے کچھ اچھا نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ عقل سے کام لو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔“

”خاموش ہو جاؤ فخر! تمہیں اس کی وکالت کرنے کے کتنے پیسے ملے ہیں۔ کیا اچھا نہیں کیا ہے میں نے۔“

شہباز گیلانی نے اپنا شملہ اتار کر میرے قدموں میں رکھنا چاہا اگر اس کی بزرگی کا خیال نہ ہوتا تو یقین کر دیتا۔

میں اسری کو اپنے ہاتھ سے پار دیتا اور اس پہ مجھے انسو بھی نہ ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں فرار ہونے والی لڑکی کو گولڈ میڈل پہناؤں۔ اگر تم نے میری طرح ٹوٹ کر محبت کی ہو تو تمہیں پتہ چلے کہ جب اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اس جذبے کا خون ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔“

”زیادہ! تم بھی بہت سی باتوں سے لاعلم ہو اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اسری کو استعمال کیا گیا ہے تو خدا کی مصلحت پہ میرا ایمان اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اسری کا ہم سے ٹکرانا بے سبب نہیں ہے۔ شمی اور خضر کا آپس میں قریبی رشتہ ہے اس حوالے سے میں شمی کو ٹولنے کی کوشش کروں گا۔ تم خوا مخواہ کے شبہات کو دل میں جگہ مسترد۔ اسری کا دامن آلودہ نہیں ہے۔ اسری ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہے ڈاکٹر ہے آخر کچھ تو ایسا ہوا ہو گا جو وہ رات کے اندھیرے میں یوں چوروں کی طرح گھر چھوڑنے پہ مجبور ہوئی۔ مجھے انسانوں کو پرکھنے کا دعوا تو نہیں ہے لیکن اسری کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے غلط نیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالا ہو گا۔“

زیادہ چپ چاپ سامنے سڑک پہ نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

آنے والی بدنامی کا رخ مڑ گیا تھا۔ فخر انہیں یقین دلا کر رخصت ہوا تھا۔ وہ اسی وقت اسری سے پوچھ کچھ کرنا چاہتے تھے مگر وہ پہلے ہی سلطانہ خاتون کے تیز و تند نوکیلے جملوں کی زد میں تھی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ جب شمی کی چیخوں سے ساری حویلی گونجنے لگی۔

ان کے خاندان میں دوسری تیسری یا پھر چوتھی شادی نئی یا عجیب بات نہیں تھی۔ مگر صولت گیلانی

اپنی امی کے ساتھ ڈرائیو ہاشم پہلی بار حویلی میں داخل ہوا۔ اس کی امی نگار صولت گیلانی کی دوسری بیوی اور ہاشم سوتیلا بیٹا تھا۔ چھ سال پہلے نگار کی پہلی شادی الیاس کے ساتھ ہوئی تھی ڈیڑھ سال بعد الیاس ایک بیٹے کی نگہبانی اسے سوئپ کر ایک حادثے میں جان گنوا چکے تھے۔

صولت گیلانی کی طرف سے جب اسے شادی کا پیغام ملا تو ہاشم ساڑھے چار کا تھا۔ نگار صولت کی ایک دور پرے کی خالہ کی بیٹی تھی۔ اپنی نرم دل فطرت اور من موہنی صورت کی بنا پر صولت کو نگار بہت اچھی لگتی تھی۔

ان کے خاندان میں دوسری تیسری یا پھر چوتھی شادی نئی یا عجیب بات نہیں تھی۔ مگر صولت گیلانی

اپنی امی کے ساتھ ڈرائیو ہاشم پہلی بار حویلی میں داخل ہوا۔ اس کی امی نگار صولت گیلانی کی دوسری بیوی اور ہاشم سوتیلا بیٹا تھا۔ چھ سال پہلے نگار کی پہلی شادی الیاس کے ساتھ ہوئی تھی ڈیڑھ سال بعد الیاس ایک بیٹے کی نگہبانی اسے سوئپ کر ایک حادثے میں جان گنوا چکے تھے۔

”خاموش ہو جاؤ فخر! تمہیں اس کی وکالت کرنے کے کتنے پیسے ملے ہیں۔ کیا اچھا نہیں کیا ہے میں نے۔“

شہباز گیلانی نے اپنا شملہ اتار کر میرے قدموں میں رکھنا چاہا اگر اس کی بزرگی کا خیال نہ ہوتا تو یقین کر دیتا۔

میں اسری کو اپنے ہاتھ سے پار دیتا اور اس پہ مجھے انسو بھی نہ ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں فرار ہونے والی لڑکی کو گولڈ میڈل پہناؤں۔ اگر تم نے میری طرح ٹوٹ کر محبت کی ہو تو تمہیں پتہ چلے کہ جب اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اس جذبے کا خون ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔“

”زیادہ! تم بھی بہت سی باتوں سے لاعلم ہو اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اسری کو استعمال کیا گیا ہے تو خدا کی مصلحت پہ میرا ایمان اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اسری کا ہم سے ٹکرانا بے سبب نہیں ہے۔ شمی اور خضر کا آپس میں قریبی رشتہ ہے اس حوالے سے میں شمی کو ٹولنے کی کوشش کروں گا۔ تم خوا مخواہ کے شبہات کو دل میں جگہ مسترد۔ اسری کا دامن آلودہ نہیں ہے۔ اسری ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہے ڈاکٹر ہے آخر کچھ تو ایسا ہوا ہو گا جو وہ رات کے اندھیرے میں یوں چوروں کی طرح گھر چھوڑنے پہ مجبور ہوئی۔ مجھے انسانوں کو پرکھنے کا دعوا تو نہیں ہے لیکن اسری کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے غلط نیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالا ہو گا۔“

زیادہ چپ چاپ سامنے سڑک پہ نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

آنے والی بدنامی کا رخ مڑ گیا تھا۔ فخر انہیں یقین دلا کر رخصت ہوا تھا۔ وہ اسی وقت اسری سے پوچھ کچھ کرنا چاہتے تھے مگر وہ پہلے ہی سلطانہ خاتون کے تیز و تند نوکیلے جملوں کی زد میں تھی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ جب شمی کی چیخوں سے ساری حویلی گونجنے لگی۔

ان کے خاندان میں دوسری تیسری یا پھر چوتھی شادی نئی یا عجیب بات نہیں تھی۔ مگر صولت گیلانی

اپنی امی کے ساتھ ڈرائیو ہاشم پہلی بار حویلی میں داخل ہوا۔ اس کی امی نگار صولت گیلانی کی دوسری بیوی اور ہاشم سوتیلا بیٹا تھا۔ چھ سال پہلے نگار کی پہلی شادی الیاس کے ساتھ ہوئی تھی ڈیڑھ سال بعد الیاس ایک بیٹے کی نگہبانی اسے سوئپ کر ایک حادثے میں جان گنوا چکے تھے۔

صولت گیلانی کی طرف سے جب اسے شادی کا پیغام ملا تو ہاشم ساڑھے چار کا تھا۔ نگار صولت کی ایک دور پرے کی خالہ کی بیٹی تھی۔ اپنی نرم دل فطرت اور من موہنی صورت کی بنا پر صولت کو نگار بہت اچھی لگتی تھی۔

ان کے خاندان میں دوسری تیسری یا پھر چوتھی شادی نئی یا عجیب بات نہیں تھی۔ مگر صولت گیلانی

اپنی امی کے ساتھ ڈرائیو ہاشم پہلی بار حویلی میں داخل ہوا۔ اس کی امی نگار صولت گیلانی کی دوسری بیوی اور ہاشم سوتیلا بیٹا تھا۔ چھ سال پہلے نگار کی پہلی شادی الیاس کے ساتھ ہوئی تھی ڈیڑھ سال بعد الیاس ایک بیٹے کی نگہبانی اسے سوئپ کر ایک حادثے میں جان گنوا چکے تھے۔

کے بیٹے شہباز کو جو پہلی بیوی سے تھا۔ باپ کی دوسری شادی بالکل بھی اچھی نہیں لگی خاص طور پر ہاشم۔ اس نے اس سے خدا واسطے کا بیرباندہ لیا تھا سرخ و سفید گھلو سا سرے بالوں والا ہاشم سب کو ہی اچھا لگنے لگا تھا یہاں تک کہ صولت کی پہلی بیوی صوفیہ بھی اسے بید چاہنے لگی تھی۔

شہباز خود سوکھا سڑا بھدے نقوش والا ایک زرد رو لڑکا تھا اور اپنی شکل و صورت کے معاملے میں کافی حساس تھا۔ ہاشم کو ذرا ذرا سی بات پر وہ پیٹ ڈالتا۔ جب بھی صولت سے شکایت کی جاتی۔ وہ شہباز کا مزاج درست کرنے کا وعدہ کرتے مگر عملاً انہوں نے کبھی بھی اسے یہ نہیں سمجھایا کہ ہاشم تمہارا بھائی ہے۔ اس کا خیال رکھا کرو۔ کون سا ہاشم ان کا گھٹا تھا جو وہ اپنے بیٹے کو سرزنش کرتے۔

وقت گزرتا گیا۔ شہباز کالج میں اور ہاشم مڈل اسینڈرڈ میں پڑھ رہا تھا جب شہباز کی سگی پھوپھی اور پھوہا گھر میں اچانک آگ بھڑک اٹھنے سے جھلس گئے ابتدائی طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے ٹرپ ٹرپ کر دم توڑ دیا۔ اس شب ان دونوں کی اکلوتی اولاد زری اپنے ماموں صولت کے گھر کھیلنے کھیلنے وہیں سو گئی تھی۔

اب ماموں کا گھر اس کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ چھ سالہ زری اور دس سالہ ہاشم کا درد مشترک تھا۔ وہ اکثر اس کے پاس آ جاتی اور اس سے کہانیاں سنتی۔ شہباز نے کالج چھوڑ دیا تھا۔ اسے تعلیم سے بالکل لگاؤ نہیں تھا۔ اب تک بھی مارے باندھے ابا کے ڈر سے پڑھ رہا تھا۔ مسلسل غیر حاضری اور ناپسندیدہ حرکات کے باعث پرنسپل اور استاذہ کرام اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ اسے کالج سے نکال دیا جاتا شہباز نے (اپنے تین) خود ہی اس کالج سے دو حرف بھیج دیے۔ (تین تین سالہ لڑکے لڑکیاں) ہاشم اور زری کی پسندیدگی محبت میں ڈھل چکی تھی۔

صولت ہاشم کو بہت پسند کرنے لگے تھے کیونکہ وہ صولت ہاشم کو بہت پسند کرنے لگے تھے کیونکہ وہ

بہت ذمہ دار اور سمجھ دار تھا۔ ان کے بغیر کہ اس نے صولت کے اکثر کام سنبھال لیے تھے جبکہ شہباز جو ان کا سگایا تھا اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ اسے سدھارنے اور گھر کے معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے صولت نے اس کی شادی سلطانہ خاتون سے طے کر دی۔

یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ نگار کے ہاں ہاشم کے بعد اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شہباز کی ہاشم سے نفرت کا وہی عالم تھا بلکہ اب تو اس میں اور شدت آگئی تھی وہ شروع سے ہی ہاشم کی ہر پسندیدہ چیز اس سے چھینتا آیا تھا۔ زری اور اس کی محبت بھی اچانک ہی اس کی نگاہ میں آئی تھی۔

نرم و نازک سی زری اسے بھی بہت اچھی لگتی تھی پھر وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ وہ ہاشم کے قبضے میں چلی جائے۔

اسے زری سے محبت یا عشق نہیں تھا۔ وہ تو بس اسے اس کے حسن اور ہاشم سے محبت کے صلے میں کسی طرح بھی نیچا دکھانا چاہتا تھا سو ایک روز بڑے آرام سے صولت گیلانی سے کہہ دیا کہ۔۔۔

”میں زری سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں“ یہاں پر اسے شکست فاش ہو گئی کیونکہ صولت گیلانی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ زری کی شادی ہاشم سے کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ نگار شاید یہی سننے کے لیے زندہ تھی سو ایک شب سکون سے سو گئی بھی نہ اٹھنے کے لیے۔

زری اور ہاشم کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس وقت شہباز کا پہلو بھی کا بیٹا برتین سال کا تھا۔ شہباز کی حالت چوٹ کھائے ناگ کی طرح تھی۔ شہباز کے دو چھوٹے بھائی اور بھی تھے مگر وہ ہاشم کے ساتھ نارمل طریقے سے ہی پیش آتے صرف ایک شہباز ہی تھا جو اونٹ کی طرح کینہ دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔

اس وقت اس کی حالت دیدنی ہوتی جب وہ ہاشم کو زری کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتا۔ شادی کے بعد پہلے

ایسی ہاشم ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ اری کا حسن ماں بننے کے بعد اور بھی نکھر آیا تھا۔ ہاشم کو افسوس ہوتا کہ یہ گوہر نایاب اسے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ خواجہ اس نے سلطانہ خاتون سے زری کی شادی کر دی تھی۔ شہباز کی بدلی ہوئی نگاہ نہ محسوس کرتی۔

رابعہ کے بعد اسری پیدا ہوئی۔ وہ دو سال کی ہو چکی تھی۔ ہاشم دو دن کے لیے لاہور ایک ضروری کام سے ہوا تھا جب زری کو اکیلا پا کر شہباز کے اندر کا اللہ بیدار ہو گیا۔ اس رات اس نے زری کا سارا فخر و کبر میں ملا دیا بعد میں ضمیر نے ملامت کیا تو اس نے اس کو یہ کہہ کر بھلا لیا کہ میں نے ہاشم سے اپنی نارسائی اتمام لے لیا ہے۔

اسی رات زری نے گلے میں پھندا لگا کر خود کشی کر لی۔

اسی باجیا و فاشناس اور عفت باب عورت کے لیے ہاشم کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ وہ کیسے ہاشم کے سامنے باز کے ہاتھوں روند آگیا جو دلے کر جاتی سو اس نے ہاشم کی رسووائی کے پل پل تڑپاتے احساس سے یکدم ہار امانے کا فیصلہ کر لیا کیسے اس کے آگے شہباز کی رہنمائی کر سکتی۔

دوسرے روز ہاشم واپس لوٹا تو ایک قیامت اس کی گھر تھی۔ اس کی محبت اس کا پہلا عشق، اس کی بیوی زری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔ رابعہ اور اسری چلا چلا کر رو رہی تھیں۔ ہاشم کی کچھ مہم میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اڑتالیں کھنٹے ہوئے تھے۔ کیا ہو گیا تھا۔ دنیا اس کے لیے بے رنگ ہو چکی تھی مگر رابعہ اور اسری کے لیے وہ خود کو سمیٹنے پہ آ رہا تھا۔

اس نے کسی سے گلہ نہیں کیا نہ کسی کو الزام دیا۔ صولت گیلانی کے روکنے کے باوجود وہ حویلی میں نہیں آ۔ یہ درودیوار اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ گھر کی کمزور دیواریں اس کی محبوب بیوی کو تحفظ نہ دے سکتی تھیں۔

شہباز نے بھی ایک سوال اکثر اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برستا رہتا کہ۔ زری نے آخر خود کشی کیوں کی۔ اسے کس چیز کی کمی تھی۔ ہاشم نے اسے کبھی کسی مجروری کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ صولت گیلانی بھی زری کو بے حد چاہتے تھے۔ ان کی دو بیویاں بچیاں تھیں۔ گھر بھر آرام و سکون میسر تھا کسی چیز کی کمی بھی نہیں تھی۔ لے دے کربات پھرو ہیں اٹک جاتی۔ زری نے خود کشی کیوں کی؟

صفیہ اس کے جانے کا سن کر رو پڑیں۔ وہ ان کا سگایا بیٹا نہیں تھا مگر انہیں سگی ماں کا سادہ رجہ دیتا آیا تھا۔ شہباز سے بڑھ کر وہ ان کے کئے کا مان رکھتا تھا۔ اتنے برسوں میں انہیں ہاشم اور اپنے تینوں بیٹوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ زری سے اس کی شادی ہونے کے بعد ان کی محبت میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسری اور رابعہ پہ وہ بے انتہا شفقت لٹاتیں۔

شہباز نے بھی رسماً روکنا چاہا مگر ہاشم نے وہی کچھ کیا جو اس کے دل میں تھا۔ وہ اسری اور رابعہ کے ساتھ لاہور آگیا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں سرکاری نوکری کا حصول آج کل کی طرح جوئے شیر لانے کے برابر نہیں تھا۔ اپنے دوست جواد لطیف کے توسط سے اسے فارن آفس میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ رابعہ اور اسری کے لیے ہاشم نے کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی جو اسے جواد لطیف نے ڈھونڈ کر دی تھی۔

ملازمت کے بعد تو ہاشم کے پاؤں میں جیسے چکر سا بندھ گیا۔ کبھی اس ملک۔ کبھی اس ملک۔ یونہی زندگی کے دن گزر رہے تھے۔

ہاشم کے شہر آنے کے تین ماہ بعد شہباز کے گھر بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام اس نے زری رکھا۔ اس سے جانے شہباز کے کون سے جذبے کی تسکین ہوئی تھی وہ لاڈ میں اسے اکثر زری کے نام سے پکارتا۔

ہاشم کا رابطہ جو خطوط کی صورت میں قائم تھا، صولت گیلانی اور صفیہ بیگم کے انتقال کے بعد وہ بھی

ختم ہو گیا۔ عرصہ دراز سے اسے شہباز، سکندر اور مقبول کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔

رابعہ اور اسری کو ہاشم نے حقیقت سے لاعلم رکھنا بہتر سمجھا تھا۔ اس نے انہیں زری کے حوالے سے یہی بتایا تھا کہ ان کے بچپن میں ہی وہ فوت ہو گئی تھی۔ اسری کو ماں کے وجود کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

رابعہ سمجھ دار اور معاملہ فہم تھی۔ اسری جذباتی اور متلون مزاج تھی مگر ان دونوں کے دم سے ہی ہاشم کی زندگی برقرار تھی۔ اس نے دوسری شادی کے بارے میں بھول کر بھی نہیں سوچا تھا، حالانکہ آبلہ پائی کے اس بنجر راستے میں کئی سایہ دار سرسبز نخلستان بھی آئے تھے مگر وہاں رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔

اب چند برسوں سے وہ پاکستان میں ہی تھا۔ اسری پڑھ رہی تھی۔ رابعہ نے پڑھائی موقوف کر دی تھی۔ برسوں بعد شہباز نے اچانک ہاشم کو کھوج نکالا اور اپنی محبت سے ملا کہ ہاشم کو اس کا برسوں پرانا رویہ خواب معلوم ہونے لگا۔

ہاشم خود سے یہ اقرار کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ اس کے دل میں بچپن سے ہی شہباز کا نفسیاتی خوف بیٹھا ہوا ہے۔ شہباز کو یوں لگ رہا تھا کہ قدرت دوبارہ اسے وہیں لے آئی ہے، اسری ہو، اپنی ماں کی تصویر تھی۔ وہی مسکراہٹ، وہی آنکھیں، وہی سائے میں ڈھلا وجود۔ زری مجسم ہو کر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ شہباز نے اپنے اندرونی شدت پسند منتقم مزاج انسان کو کبھی سونے دیا ہی نہیں تھا۔ رابعہ اور اسری کو دیکھ کر اسے یہ خیال آیا تھا، اگر وہ انہیں حویلی میں لے جائے اور وہیں خاندان میں ان کی شادی کر دے تو ہاشم کو ایک بار پھر زندہ دیکھ سکتا ہے۔ اس کے ہاشم کو جو زری کی موت کے بعد اس کی دست برد سے دور ہو گیا تھا۔ برائی نفرت جو ہاشم کے دل میں گونا گوں خون میں رچی بسی تھی دوبارہ ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر سامنے آگئی تھی۔

اس سلسلے میں ہاشم کو کرم کرنے کے لیے اس نے اپنے دو ملازم بلا معاوضہ اس کے پاس شہر بھجوا دیے۔ اسری اور رابعہ ان سے مانوس ہو گئی تھیں۔ اسری بڑے پیار سے — بڑے ابا کہہ کر مخاطب کرتی تھیں یوں لگتا جیسے زری — کھن میں بس رہی ہو۔ بہت مختصر عرصے میں شہباز نے ہاشم پر اپنا گزشتہ رعب و داب قائم کر لیا۔ ہاشم اس کے زیر اثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے خاور کا رشتہ رابعہ کے لیے منظور کر لیا تو شہباز کو اپنا غصہ چھپانا دشوار ہو گیا۔ اپنے تئیں وہ ہاشم کی بیٹیوں کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ بابر نے جب اکبر کو مار مار کر زخمی کر دیا اور روپوش ہوا تو شہباز اسری کے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا۔

\*\*\*

زریں کا بے جان جسم بچکے کے ساتھ جھول رہا تھا۔ شہباز کی نگاہوں میں برسوں پرانا منظر زندہ ہو گیا۔ زری کی لاش اسی طرح چھت کی کڑیوں کے ساتھ بندھی رسی کے سہارے جھول رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زریں کو کسی شہباز نے ہاں آہٹ نہیں کیا تھا۔

زری کی خودکشی کی وجہ شہباز تھے اور زریں کی موت کا سبب بھی شہباز تھے۔ انہوں نے لاعلمی میں زریں کی محبت اسری کو سونپ دی تھی۔ کتنی پیچیدگیوں اور سازشوں کے ذریعے انہوں نے زیادہ اسری کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ وہ سیدھے سادے طریقے سے زریں کو بھی زیادہ کی زندگی میں شامل کر سکتے تھے۔

مگر شاید کات تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا۔ قدرت نے کتنے برسوں بعد انصاف کے اس کیس کو اختتام تک پہنچا کر فیصلہ سنایا تھا۔ ایسا فیصلہ جس سے کوئی بھی انحراف نہیں کر سکتا۔

اس کا انصاف مکمل اور بے داغ ہوتا ہے۔ شہباز کے ساتھ مکمل انصاف کیا گیا تھا۔

\*\*\*

کل جس گھر سے اسری کی ڈولی اٹھنی تھی اس گھر سے آج زریں کا جنازہ اٹھا تھا۔ شہباز صبح سے سکتے کی حالت میں تھے۔

شادی کا گہرا مٹا کدہ بن چکا تھا۔ اسری کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زریں کا آخری لمحات میں لکھا خط اس نے بھی پڑھا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ زریں اتنی گہری، جنونی اور بے طبری تھیں۔ اگر وہ تھوڑی سی بات کر کے اسری کو زیادہ کے بارے میں پہلے ہی بتا دیتی شاید حالات کچھ اور ہوتے۔ اس نے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اسری کے ذہن پر نفسیاتی دباؤ ڈالا۔ اتنا زیادہ کہ وہ گھبرا کر اس کی برکشتں باتوں میں الرات کے اندھیرے میں گھر سے نکل گئی۔

اسے اس بات کا بالکل بھی افسوس نہیں تھا کہ زریں نے اسے غلط راہ دکھائی ہے۔ اس نے اسری سے کچھ اور کہا اور خضر سے کچھ اور۔ مقصد یہی تھا کہ ات کھل جانے پر اس کا نام کہیں نہ آئے۔ اسری کا ماننا بھی ہٹ جائے اور وہ اپنی محبت زیادہ کو بھی حاصل لے لے۔ اس کی بلا سے اسری بے شک تباہ و برباد جا جائے۔

وہ اسری کو زیادہ اور فخر کے ساتھ آمادہ کر سمجھ گئی تھی کہ اس کا منصوبہ قیل ہو چکا ہے۔ شہباز کی طرح سے بھی ناکامی سے نفرت تھی۔ اور محبت میں ناکامی بچنے کے لیے اس نے موت جیسا کامیاب فیصلہ لیا تھا۔

\*\*\*

زریں کی خودکشی کے بعد بدنامی کی جو دھول اٹھی، اس نے شہباز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ انہیں چپ سی لگ گئی۔ خاموش بیٹھے خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ اسری کو ان سے شکایتیں تھیں مگر انہیں اس بات میں دیکھ کر اسے ان پر رحم سا آتا۔

گاؤں میں زریں کی خودکشی کے بارے میں مختلف رس گردش کر رہی تھیں جن میں سے کوئی بھی سچ نہیں تھی۔

اسری سب کا بدلا ہوا زویہ نوٹ کر رہی تھی۔ اب وہ سب پہلے کی طرح چمکی اور سرد مہری سے پیش نہیں آتے تھے۔

سکندر اور مقبول کو شہباز سے جو شکایتیں تھیں، وہ ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔ برسوں کی دلی دھکدورت ابھر آئی تھی۔ دونوں بھائیوں کو شکوہ تھا کہ شہباز نے انہیں ان کا جائز مقام نہیں دیا ہے۔ وہ اب اپنے جائز مقام کو حاصل کرنے کے لیے جت گئے تھے کیونکہ شہباز کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اگلو تا بیٹا برابر اپنے مشاغل اور مصروفیات میں گم تھا۔ باپ کی دل گیر کیفیت کی اسے بالکل پروا نہیں تھی بلکہ اپنے تئیں وہ اب خود کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔ باپ کی پوچھ گچھ کا خوف رخصت ہو چکا تھا۔

شہباز کی ساری زندگی کی کمائی بابر اور زریں تھے۔ زریں رہی نہیں اور جو رہ گیا، اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

بذریعہ خط اور ٹیلی فون رابعہ کو ہونے والے تمام واقعات کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس نے جلد از جلد وطن واپسی کے لیے سیٹ ریزرو کروالی۔

اسری کا مستقبل غیر یقینی سا تھا۔ مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ زیادہ ملک سے طلاق لیتا چاہتی ہے تو وہ اس کے ساتھ ہیں۔ مقبول گیلانی نے بڑی نفرت سے کہا تھا۔

”رشتہ شہباز بھائی نے طے کیا تھا۔ بذات خود وہ فرعون بن بیٹھے تھے۔ جرگے کے فیصلے کے نتائج وہی بھگتیں، تمہارا کیا قصور ہے۔ اگر تم آج جرگے کے سامنے یہ کہہ دو کہ تمہیں شہباز بھائی نے زبردستی ڈرا دھمکا کر نکاح پہ مجبور کیا تھا پھر دیکھنا شہباز کا پورے گاؤں میں کیسے جلوس نکلتا ہے، کیسی بدنامی ہوتی ہے۔ جرگے والے از سر نو فیصلہ کریں گے جو یقیناً تمہارے حق میں ہوگا۔“

اسری کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مقبول انکل بول رہے ہیں۔ بڑے ابا کے سامنے اس نے انہیں ہمیشہ

سر جھکائے مودب بیٹھے رک رک کر بولتے ہوئے سنا تھا۔ آج کس قدر تحقیر اور تضحیک بھرا انداز تھا ان کا۔ سکندر انکل نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اسری کو شش کے باوجود ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ جب بڑے ابا نے یہ سب کیا تھا تو اس وقت آپ کہاں تھے؟ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور مضبوط لہجے میں بولی۔

”انکل! میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“  
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جیسے تمہاری مرضی مگر وہاں اکیلے گھر میں تم کیا کرو گی؟“ مقبول حیرت سے بولے۔

”انکل! رابعہ! آپی کل پاکستان پہنچ رہی ہیں میں اکیلی کہاں ہوں۔ جو اد انکل بھی تو ہیں نا۔ ہو سکتا ہے میں آپی کے ساتھ ہی چلی جاؤں یا پھر نہ جاؤں اور جاب کر لوں۔ میری تنہائی کی آپ فکر مت کریں۔ جو اد انکل کی رشتے کی ایک بہن بیوہ ہیں، اولاد ہے نہیں میں انہیں ساتھ رکھ لوں گی۔“

”ساری زندگی ایسی تو نہیں گزر سکتی نا۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو میں حمزہ کے گھر والوں سے بات کروں مگر پہلے یہ زیاد ملک والا مسئلہ نمٹ جائے۔ تم کسی روز جرگے کے رویہ بیان دو تو کوئی پیش رفت ہو۔“ سکندر بغور اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو مبہم سوجوں کی تفسیر بنا تھا۔ جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔

\*\*\*

اس نے تیاری مکمل کر لی تھی سب سے مل کر وہ بڑے ابا کے پاس آئی جو اپنے کمرے میں لیٹے ساکت نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہے تھے۔

اسری نے بھانپ لیا تھا کہ وہ ڈپریشن کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر ان کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار رہتی اور اس میں کوئی تبدیلی نہ آتی تو اس کا خیال یہ ہو گا کہ ان کے لیے نقصان دہ ہو گا۔ کیا نقصان جس کی بھلائی ممکن نہیں ہے؟ اس نے سوچا۔

”بڑے ابا! میں واپس شہر جا رہی ہوں اپنے گھر۔“

ان کی ساکت نگاہوں میں اضطراب برپا ہو گیا۔ اسری ان کے سرہانے کھڑی تھی۔ انہوں نے اپنا راز ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جو اسری نے فوراً تھام لیا۔ شہباز نے اسری کو اپنے قریب بٹھالیا اور اسے دیکھ لگے۔ اسری ان کے دیکھنے کے انداز سے الجھن کی محسوس کرنے لگی۔ شہباز کے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں پھیل سے گئے۔

”بڑے ابا!“ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ شہباز نے کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ان کی دلدوز آہیں، زار و قطار آنسو اسری سے دیکھے نہیں جا رہے تھے۔  
”مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ تم اگر چلی گئیں تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھے مت چھوڑ کر جانا میں بہت ڈرنے لگا ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ میرے خواب میں آتی ہے اس سے کہوتا مجھے معاف کر دے۔“ ان کے مبہم ار بے ربط جملے اسری کی عقل سے بالاتر تھے۔  
وہ خود ان کے ساتھ رو رہی تھی۔

”تم میری بیٹی ہونا، میری بیٹی ہونا۔ کو تم میری بیٹی ہو۔“ ان کا انداز یکا یک جنونی ہو گیا۔  
”کو، تم میری بیٹی ہو۔“ انہوں نے جسم کی سادہ طاقت سے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔ دروازے سے سلطانہ خاتون کا خوفزدہ چہرہ جھانک رہا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسرے بھی صورت حال کا جائزہ لینے اور تماشہ دیکھنے آ گئے۔

”بڑے ابا! میں آپ کی بیٹی ہوں، صرف آپ کی۔“ وہ ان سے لپٹ گئی۔ اسے پتا تھا کہ بڑے ابا اس وقت انتہائی درجے کی محبت اور توجہ کی ضرورت میں ہیں۔ اگر یہاں پہ ذرا سی بھی کوتاہی کی گئی تو انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ اپنی جان بھی لے سکتے ہیں۔

”بڑے ابا! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اگر گئی تو آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی، اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔“ انہیں بچوں کی طرح حشر کر رہی تھی۔  
کافی دیر بعد جب وہ پرسکون ہوئے تو اسری ان کے کمرے سے نکل آئی۔ سلطانہ خاتون متفکر سی تھیں۔

اسری ان کے پاس آ گئی۔

”بڑی امی! میں بڑے ابا کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ انہیں علاج کی ضرورت ہے۔ شہر میں بہت سے اسپتال ہیں۔ وہاں ان کا بہترین علاج ہو سکے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ زیادہ دیر اسی حالت میں رہے تو خود کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

سلطانہ کا اترا اترا چہرہ جاپتے ہوئے اس نے حتی الامکان محتاط الفاظ کا چناؤ کیا تو ان کے چہرے پہ ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔  
”تم بہت اچھی ہو، کاش شہباز تمہارا تھوڑا سا خیال کر لیتے تو آج ان حالوں کو نہ پہنچتے۔ انہیں تمہاری بد دعا لگ گئی ہے۔“  
اسری تڑپ ہی تو تھی۔

”بڑی امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے ابا کو کبھی بد دعا نہیں دی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی بلکہ جو کچھ بھی ہوا، میں نے اسی میں اوپر والے کی مصلحت جانی تھی۔ پتا ہے میں نے بڑے ابا کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت سے وہ مجھے اچھے لگنے لگے تھے اور اب انہیں اس کمپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں پہلی فرصت میں بڑے ابا کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا چاہتی ہوں۔“

سلطانہ خاتون کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔  
”کیسا نرم دل ہے اس کا۔ ہاشم کی طرح کتنی بامروت ہے۔“ انہوں نے دل میں خود سے کہا۔  
”ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گی بلکہ میں شہباز کو بھی کہہ دیتی ہوں تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔“ سلطانہ اٹھ گئیں۔

اسری تجھی اپنا سامان جو چند جوڑے کپڑوں اور دیگر چھوٹی مولی اشیاء پر مشتمل تھا رکھنے لگی۔  
مگر چڑے کا بیگ جس میں اس کے ڈاکو منٹس اور زرین کی دی گئی اور چیزیں تھیں، کہیں نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پریشانی سی پریشانی تھی۔ اس بیگ میں اس کی عمر بھر کی تعلیمی جدوجہد اور کیہ بڑبند تھا۔ اگر وہ بیگ نہ ملتا تو سب بیکار تھا۔

”قریب تھا کہ وہ رو پڑتی۔ سلطانہ دوبارہ اس کے پاس ہوں۔ انہیں علاج کی ضرورت ہے۔ شہر میں بہت سے اسپتال ہیں۔ وہاں ان کا بہترین علاج ہو سکے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ زیادہ دیر اسی حالت میں رہے تو خود کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“  
سلطانہ کا اترا اترا چہرہ جاپتے ہوئے اس نے حتی الامکان محتاط الفاظ کا چناؤ کیا تو ان کے چہرے پہ ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔

”تم بہت اچھی ہو، کاش شہباز تمہارا تھوڑا سا خیال کر لیتے تو آج ان حالوں کو نہ پہنچتے۔ انہیں تمہاری بد دعا لگ گئی ہے۔“  
اسری تڑپ ہی تو تھی۔

”بڑی امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے ابا کو کبھی بد دعا نہیں دی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی بلکہ جو کچھ بھی ہوا، میں نے اسی میں اوپر والے کی مصلحت جانی تھی۔ پتا ہے میں نے بڑے ابا کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت سے وہ مجھے اچھے لگنے لگے تھے اور اب انہیں اس کمپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں پہلی فرصت میں بڑے ابا کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا چاہتی ہوں۔“

سلطانہ خاتون کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔  
”کیسا نرم دل ہے اس کا۔ ہاشم کی طرح کتنی بامروت ہے۔“ انہوں نے دل میں خود سے کہا۔  
”ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گی بلکہ میں شہباز کو بھی کہہ دیتی ہوں تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔“ سلطانہ اٹھ گئیں۔  
اسری تجھی اپنا سامان جو چند جوڑے کپڑوں اور دیگر چھوٹی مولی اشیاء پر مشتمل تھا رکھنے لگی۔  
مگر چڑے کا بیگ جس میں اس کے ڈاکو منٹس اور زرین کی دی گئی اور چیزیں تھیں، کہیں نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پریشانی سی پریشانی تھی۔ اس بیگ میں اس کی عمر بھر کی تعلیمی جدوجہد اور کیہ بڑبند تھا۔ اگر وہ بیگ نہ ملتا تو سب بیکار تھا۔



”اسری! کچھ بھی سہی، تم اگر مجھے ایک بار ہی سب کچھ بتا دیتیں تو شاید سب کچھ اتنا غلط نہ ہوتا۔ تمہیں پتا نہیں ہے، دیہات کے لوگ اپنی عورتوں کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ میں پہلی فرصت میں زیادہ ملک سے ملاقات کروں گی۔ اگر وہ میری توقعات پہ پورا اترتا تو دیکھ لیں گے۔ میں خود سفید حویلی جاؤں گی۔ یہ فیصلہ دیکھ بھل کر کروں گی کہ تمہارے لیے کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب۔“

”ویسے بڑے ابا نے اچھا نہیں کیا۔ ابو کے مرنے کے بعد انہیں تمہیں سہارا دینا چاہیے تھا تاکہ خاندانی دشمنیوں کی بھیٹ چڑھا دیا۔ انہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ ہمارے لیے گرہا کھود رہے تھے، خود ہی گر گئے۔“

”نہیں آپ! پلیر اور کچھ مت کہیں۔“ خفا خفا سی رابعہ کے منہ پہ اسری نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”کچھ بھی کہہ لیں، چاہنے کے باوجود میں بڑے ابا سے نفرت نہیں کر سکتی، نہیں کر سکتی۔ اس وقت وہ بری طرح ٹوٹ کر بکھرے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ نفرت کے جواب میں نفرت کی ہی آبیاری کی جائے۔ ہم سزا جزا کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔“

اسری نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا تاکہ رابعہ اس کی آنکھوں میں جھلک کرتے آنسو نہ دیکھ سکے۔ رابعہ نے زبردستی اس کی آنکھوں پہ سے ہاتھ ہٹائے اور دھیرے سے بولی۔

”اسری! میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ اسری نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ رابعہ نے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر اسے یقین دلایا۔

”ہاں اسری! ہم بڑے ابا کو سمیٹیں گے۔“

”آپ! آپ بھی انہیں میری طرح معاف کر دیں۔“

پلیر ہی بہت دھکی ہیں، اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ سر ہلکے کرے میں تکلیف دہ سناتا اور آیا تھا۔

شہباز ان دونوں کی اتنی توجہ اور دیکھ بھال سہہ نہیں پارہے تھے۔ وہ کیسے انہیں بتاتے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔

اسری نے انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔

ڈاکٹر حمزہ سے اس کی اچانک ملاقات ہوئی۔ وہ انگلینڈ سے واپس آکر اسی ہاسپٹل میں دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے تھے، جہاں اسری بھی ہاؤس جاب کرتی تھی۔

وہ اسری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر اسری کی طرف سے سرد مہری کی سی کیفیت تھی۔

”اسری! گاؤں سے کب واپسی ہوئی ہے۔“ ان کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور تھا۔

”میں بچکھلے ہفتے ہی آئی ہوں بڑے ابا کے ساتھ۔ انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانا ہے۔ تین چار دن سے ان کی طبیعت کافی خراب ہے، بی پی شوٹ کر جاتا ہے۔“

”اوہ آئی سی۔ تو وہ بھی آئے ہیں۔“

حمزہ کا لہجہ طنزیہ تھا جو اسری کو بہت برا لگا۔ اس نے حساب کتاب آئندہ کے لیے اٹھار کھے۔ اس وقت تو وہ بڑے ابا کے لیے کافی پریشان تھی۔

حمزہ طویل راہداری میں کھڑے آخر تک اسے جاتا دیکھتے رہے۔

زیادہ غیض و غضب کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بچھا تھا اور چہرہ اندرونی اضطراب کا غماز نظر آ رہا تھا۔

اماں جی اور انوار ملک خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زیادہ کی یہ کیفیت ایک گھنٹے سے اسی طرح برقرار

ان کے ایک قابل اعتماد ملازم کے علاوہ فخر نے بھی اگر یہ پردہ ہٹ جاتا تو اسری اور رابعہ کے دل میں شہباز کے لیے جو ہمدردی اور محبت تھی، وہ باتی نہ رہتی اور سر

کیونکہ اسری کا نکاح شہباز نے اسے دھمکیاں دے کر میں تو بالکل بھی نہیں۔“ اسری اس کے لیے ہنگامہ زبردستی کرایا ہے۔

یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ اسری کے معاملے میں شہباز کا کردار پوری طرح کھل چکا تھا اور بہت سوں کو اسری سے ہمدردی بھی

تھی مگر زیادہ تو اسری سے محبت تھی، اب محبت کے ساتھ ساتھ وہ اس کی انا کا بھی مسئلہ بن چکی تھی۔ اس کے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ اسری بھری محفل میں اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کرتی۔

فخر تو اس کا بہترین دوست اور رازواں تھا۔ وہ زیادہ کے دل پہ پل پل گزرنے والی قیامت سے بخوبی واقف تھا۔ یہ سوال اسے بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر اسری نے اسے ٹھکرا دیا تو زیادہ کا کیا رد عمل ہوگا؟

وقت گزر رہا تھا اور پردہ غیب سے جانے کیا ظہور میں آنے والا تھا۔

وہ سفید براق بستر پہ ہوش و خرد سے بیگانہ پڑے تھے۔

آخری وقت شہباز کی بے بس آنکھوں نے اسری کو دیکھا، اس کے پہلو میں زری بھی کھڑی تھی۔ طنزیہ مسکراتی ہوئی وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زری اور اسری کا وجود گنڈھ ہو رہا تھا۔

شہباز کو اپنا وجود بے جان ہوتا لگ رہا تھا۔ اسری ان پہ جھکی ہوئی ان کے ماتھے پہ پار کر رہی تھی۔ شہباز کی روح کھینچ کر آنکھوں میں منجمد ہو گئی۔ زری کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔ وہاں تو صرف اسری تھی، روتی دھوتی اسری۔

شہباز کو گاؤں میں ہی دفنایا گیا۔ سلطانہ خاتون کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ دوسری بار مری ہوں۔

سفید حویلی والے تعزیت کے لیے آئے۔ رابعہ اور اسری بھی گاؤں میں تھیں۔

شہباز کی موت کو چند روز ہوئے تھے، جب مقبول اور سکندر نے دوبارہ زیادہ اور اسری والا مسئلہ اٹھایا۔

”اسری! میں آج بہت خوش ہوں، اتنا کہ کائنات مجھے اپنی مٹھی میں بند محسوس ہو رہی ہے۔“

حمزہ کی آنکھوں سے پھوٹی چمک لبوں پہ مسکراہٹ اور چہرے پہ طاری سرمستی کی سی کیفیت ان کی اندرونی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی۔ اسری، حمزہ کے گھر میں تھی۔ حمزہ نے حال ہی میں یہ بتا دیا کہ فرزند گھر خرید اٹھا اور اسری کو آج دکھانے لائے تھے۔

حمزہ کی طرف سے اس کے دل میں جو بھی ناراضی اور خفا تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ حمزہ نے سچ سچ بہت شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔

اسری نے تو حمزہ کو معاف کر دیا تھا مگر رابعہ کے لیے یہ آسان نہیں تھا۔

”میں حمزہ کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی، کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ وہ ہم سب کے جذبات سے کھلیا۔ ابو کو بھی نہیں بخشتا۔“

اس کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”اسری بٹی! تم انکار کرو تو جرگے سے بہت سے فوائد ملیں گے۔“ مقبول گیلانی اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔  
”کس قسم کے فوائد؟“ وہ انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اگر تم انکار کرو تو شہساز کی ساری جائیداد ملک زیادہ کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اس میں سے آدھی تمہاری ہوگی کیونکہ تمہیں ذہنی اور جذباتی طور پر جو کوفت اٹھانی پڑی ہے یہ جائیداد اس کے صلے میں تمہیں دی جائے گی کیونکہ یہ ہمارے یہاں کے قوانین ہیں جس میں عورت کا فائدہ بھی دیکھا جاتا ہے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ شہساز کی زندگی میں اگر تم انکار کرتیں تو معاہدے کی رو سے وہ زرین کو ان کے حوالے کرتا۔ اگر شہساز کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ ہم سے رجوع کرتا مگر کیا ہماری بیٹیاں اتنی فالتو ہیں۔“  
”چھوٹے چچا! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔“ وہ حیران تھی۔

”کیوں میں تمہارے بھلے کی ہی سوچ رہا ہوں۔“ وہ براہمان گئے۔

”ہر معاملے میں عورت کو ہی آگے کیوں کیا جاتا ہے۔ جب میرا نکاح ہوا تو کسی نے بھی مجھ سے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب مجھ پر یہ مہربانی کیوں کی جارہی ہے۔ آپ میری طرف سے خود ہی سب کچھ کرنے کے مجاز ہیں۔ میری رائے کیوں طلب کی جارہی ہے۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ بڑے ابا کی جائیداد ملکوں کے قبضے میں چلی جائے۔ آپ نے سوچا ہے بڑی امی اور بابر بھائی کا کیا بنے گا؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟“

آج پہلی بار اسری نے ان کے سامنے بولنے کی جرأت کی تھی اور انہیں آئینہ دکھایا۔  
”میرا چھوٹے چچا اب یہ مناسب نہیں ہے کہ بڑی امی اور بابر بھائی خالی ہاتھ رہ جائیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ میں عدالت تک جاؤں۔ مجھے وہ بے عزتی اور توہین

گوارا ہے مگر یہ نہیں جس سے بڑی امی کے دل کو لگے۔  
”ٹھیک ہے۔“  
اسری نے انہیں بے طرح شرمندہ کیا تھا۔

\*\*\*

زیادہ پہلی بار ”ہاشم ہاوس“ میں قدم رکھا۔ گیٹ پہ متعین چوکیدار نے اندر اس کی آمد کی اطلاع دی۔ رابعہ خود باہر آئی اور اسے اندر لے گئی۔ ڈرائنگ روم میں اسری پہلے سے موجود تھی۔ زیادہ نے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور شائستگی سے احوال پوچھا۔ وہ دھیرے سے سر ہلا کر رہ گئی۔ فضا میں ایک تکلیف دہ سی خاموشی طاری تھی۔ زیادہ پہلی بار رابعہ سے ملا تھا اور متحس تھا کہ آخر رابعہ نے اسے کیوں بلوایا ہے۔ گاؤں میں جب یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ جلد ہی جرگہ طلب کیا جائے گا جس میں اسری بھی شامل ہوگی۔ اس کے تناظر میں یہ بلاوا بڑا معنی خیز تھا۔

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کیوں بلوایا ہے؟“  
”آرام سے ذرا دم تو لے لیں پھر آپ کو بتاؤں گی۔“ رابعہ خوشگوار لہجے میں بولی تو زیادہ کے خدشات یکنخت مٹ گئے۔

”آپ مجھے زیادہ بھائی بھی کہہ سکتی ہیں۔ آخر کو ہمارے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔“ زیادہ نے یہ کہتے ہوئے اچھتی ہوئی نگاہ اسری پر ڈالی جو کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

”ہوں۔“ رابعہ نے ہنکارا بھرا اور صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”بات یہ ہے کہ اسری شہر کی پروردہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر نازک احساسات کی مالک ہے۔ یہ جرگوں، بیچانتوں کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمیں یہ سب پسند نہیں ہے۔ محض دشمنی میں جو تعلق صلح کی آڑ میں جوڑا جائے اسری کے نزدیک وہ قابل قبول نہیں ہے اسی لیے یہ کہنا ہے کہ۔“

”بس اس سے آگے ایک لفظ مت کہئے گا۔“ زیادہ کا چہرہ اس کی اگلی بات کا مطلب جانتے ہی سرخ ہو گیا اور اس نے رابعہ کا جملہ کاٹ دیا۔  
”اسری اس دوران بالکل لا تعلق بنی رہی۔ اس کی بے نیازی قابل دید تھی۔“

”یہ میری عزت بن چکی ہیں۔ اس سے پہلے ان نے میرا قلبی تعلق تھا مگر اپنی عزت کا تحفظ میرے لیے قلبی تعلق سے بڑھ کر ہے۔ یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ میں محبت تو چھوڑ سکتا ہوں عزت کو پس پشت نہیں ڈال سکتا۔“

شدت جذب سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رابعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔  
زیادہ کچھ کھائے پئے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

\*\*\*

حمزہ اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر اسری کا ذہن ایک ہی جملے پر اٹکا ہوا تھا۔

”شما نل بالکل تمہاری طرح ہے۔“  
حمزہ کے اس ایک جملے پر وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔  
”آپ کو مجھے حقیقت بتا دینی چاہیے تھی شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھے تھے مگر۔“ حمزہ نے اس سے نگاہیں چرائیں۔

سیڑھے چار سال قبل حمزہ کی منگنی شما نل سے ہوئی تھی۔ بے پناہ مخالفتوں اور اعتراضات کا سامنا کرنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو پایا تھا۔ شما نل انگلینڈ میں مقیم تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ حمزہ بھی اس کے ساتھ انگلینڈ چلے اور وہیں اپنی پریکٹس

شروع کرے۔ حمزہ جو پور پور اس کی محبت میں سرشار تھے شما نل کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ شما نل نے ان پر واضح کر دیا کہ وہ پاکستان میں مستقل نہیں رہ سکتی۔ اگر حمزہ اس سے سچ محبت کرتے ہیں تو اسے انگلینڈ آنا پڑے گا۔ حمزہ کی مروانہ انا آڑے آگئی۔

انہوں نے شامل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور دھیرے دھیرے دوری کی اس آگ میں سلگتے رہے۔ ان دونوں کے مابین صرف اور صرف انا شامل تھی۔ اسری نے ہاؤس جاب کے لیے جس ہاسپٹل میں اپلائی کیا وہاں حمزہ پہلے سے ہی کام کرتے تھے۔ اسری کو دیکھ کر وہ چونک سے گئے۔ وہی شامل کی سی ہنسی، اسی کے جیسی پسند و ناپسند، چال ڈھال اور بے ساختہ انداز۔

گھر والوں کی طرف سے ان پہ شادی کے سلسلے میں دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بے دردی سے سوچا۔ اگر وہ اسری سے شادی کر کے شامل کو حیران کر دیں تو کیسا رہے گا۔ اسری کے ابو بھی ان سے مل کر خوش ہوئے مگر رشتہ طے کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ شہباز گیلانی نے ہاشم کی موت کے بعد انھیں گھر آنے سے روک دیا اور اسری سے دور رہنے کو کہا۔ طبعاً "حمزہ بزدل سے انسان تھے اور ویسے بھی کون سا انھیں اسری سے طوفانی محبت تھی، اس میں محض شامل کی جھلک ہی تو تھی۔ وہ شامل تو نہیں تھی۔ رہی سہی کسر شامل کے انگلینڈ میں ہونے والے ایکسپنڈنٹ نے پوری کر دی۔ اپنی ساری انا بالائے طاق رکھ کر شامل کے پاس انگلینڈ پہنچ گئے۔ اب وہ اسری کے سامنے معذرت پیش کر رہے تھے۔

"شامل اسی ہفتے آرہی ہے، ہماری شادی کی تقریب عنقریب ہوگی۔ مجھے مبارکباد نہیں دوگی۔" "پہلے آپ مجھے مبارکباد دیں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"میرا زیاد ملک کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے، اس سلسلے میں۔"

"اسی ہفتے اور شامل کو لانا مت بھولیے گا اور ہاں، اس ملال کو دل میں جگہ مت دیجئے گا کہ آپ نے میرا دل توڑا ہے بلکہ مجھے شرمندہ ہونا چاہیے کیونکہ آپ جب اپنی والدہ کی ساتھ ہمارے گھر آئے تھے تو مجھے سب کچھ اچھا نہیں لگا کیونکہ آپ سے پہلے ہی زیاد مجھے پسند کر چکے تھے۔ آپ کو وہ مریض یاد ہے جو مجھے بہت تنگ کرنا تھا، وہی شوہر کی حیثیت سے میری زندگی میں شامل ہوئے ہیں۔"

"کیا سر براثر ہے۔" حمزہ نے دل میں اٹھتی تاسف کی لہر کو دبائے ہوئے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مردوں، مردوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ حمزہ نے اپنی کمنٹ کا بالکل بھی لحاظ نہیں کیا تھا اور زیاد کے نزدیک نکاح کے بعد وہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی تھی۔

اس روز جب غصے کے عالم میں زیاد وہاں سے نکلا تھا تو رابعہ آپ نے اس سے کہا تھا۔

"زیاد تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ اس کا دل مت توڑو۔" اور اسری نے۔ اس کی بات سمجھ لی تھی۔

چار روز پہلے وہ حویلی رخصت ہو کر آئی تھی۔ سب نے اس محبت بھرے ماحول میں دل سے اس کا استقبال کیا تو وہ اپنے غلط اندازوں پہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

\*\*\*

رابعہ سب سے مل کر ابھی ابھی گئی تھی۔ اسری ادا اس سی تھی۔ اماں جان اسے اندر لے آئیں۔

"کیوں پریشان ہوئی ہو، ماہرہ ماہ بعد زیاد تمہیں رابعہ بیٹی سے ملوا کر لے آئے گا۔ تم خود کو تنہا مت سمجھنا"

ہم سب ہیں نا۔ میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں، تمہیں ہم سب سے کوئی بھی شکوہ یا شکایت ہو تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" اماں جی نے فرط محبت سے اسے خود سے چمٹا لیا۔

"نہیں، میں اب پریشان نہیں ہوں۔" اسری ہنسی

تو وہ مسوری ہو گئیں۔ "تم نے میرے دل کی بات کیسے سن لی۔" وہ پھر زیاد اندر آیا تو وہ چلی گئیں۔ اسری سر جھکائے زمین کو دیکھنے لگی۔ بلکہ اورنج اور گرین رنگ کے کلمہ اسوٹ میں زیورایت سے حیران شکل دیکھ کر خاصا محظوظ ہوا تھا۔ آراستہ وہ روز اول کی طرح دل نشیں لگ رہی تھی۔

"یار! ہماری شادی کو جو تھارہ روز ہے اور تم ابھی تک پہلے روز کی طرح جی پو کر رہی ہو۔" زیاد اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اسری کا چہرہ اس کی نگاہوں کی تپش سے سنسنائے لگا۔

اس نے رخ موڑنا چاہا مگر زیاد نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔

"تم نے اپنی بے رخی سے مجھے بہت جلایا ہے اور اب یوں ڈری قسمی بیٹھی ہو مجھے ہنسی آرہی ہے۔"

زیاد کے تپور بدل رہے تھے۔ "وہاں ہاسپٹل میں تو بڑی تھانیدار نظر آتی تھیں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟" زیاد نے اس کی نقل اتاری۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے مستقل طور پر اپنے مریضوں کی لسٹ میں شامل کر لیں۔" زیاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی جو حیا کے بوجھ سے مستقل جھکی ہوئی تھیں۔

"پلیز۔ آپ اس طرح مجھے مت دیکھیں۔" زیاد ہنستا چلا گیا۔

"تو پھر کیسے دیکھوں، اب انہی شوہرانہ نگاہوں سے عمر بھر دیکھوں گا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو اسری نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

زیاد کی آنکھیں جذبوں کی لو سے دھبہ رہی تھیں۔ "ذرا دعوتوں سے فارغ ہو لیں تو ہاسپٹل والا معاملہ دیکھوں گا۔ اگر تم گاؤں والے ہاسپٹل میں کام کرنا چاہتی ہو تو میں سمجھوں گا کہ گاؤں والوں کی خوش قسمتی ہوگی کیونکہ یہاں کوئی ڈاکٹر کبھی زیادہ عرصہ نہیں ٹکٹا۔"

"میں یہیں کام کروں گی۔" اسری بولی تو زیاد کا چہرہ کھل اٹھا۔